

افتخار
حarf

پر
گلستان

شہرِ جامع کے دروازے پر

شہرِ جمیع کے دروازے پر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شـعـرـ عـلـمـ کـےـ درـواـزـےـ پـرـ

انتخابِ کلام

افتخار عارف

ترتیب و مدویں

اشراق حسین

تزمین و اہتمام

جعفر نقوی، زہر انقوی

شِعْرِ عِلْمٍ كَهْ دَرْوازَهْ پَرْ

افتخار عارف

دانیال

جملہ حقوق بحق مصنف

شہر علم کے دروازے پر	:	نام کتاب
افتخار عارف	:	شاعر
اشفاق حسین	:	ترتیب و تدوین
بعض نقوی، زہر انقوی	:	زیر اہتمام
خفیف رائے	:	سرور ق
رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ	:	اشاعت اول
بمطباق اکتوبر ۲۰۰۵ء	:	
ڈیکس ایڈیشن 500	:	تعداد اشاعت
حوری نورانی	:	ناشر
مکتبہ دانیال، دکنوریا چکبرہ ۲	:	
عبداللہ بارون روڈ، گراجی	:	
پرنٹ سائل، اسلام آباد	:	طابع
تین سو پچھتر روپے	:	قیمت
دس ڈالر	:	

ISBN:969-419-021-5

SHEHER-E-ILM KE DARVAZAY PAR Selection from IFTIKHAR ARIF

Editor
ASHFAQ HUSSAIN

Co-Editors
JAFAR NAQVI - ZEHRA NAQVI

Published by
MAKTABA-E-DANYAL

Price : Rs.375/- US \$ 10

میرے اللہ میری عزت کے لیے یہی کافی ہے کہ میں تیرابندہ ہوں
اور میرے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے۔

امام علی ابن ابی طالب کرم اللہ و جہہ

انتساب

علی اور کرن کی بیٹی ام ابیہا کے لئے

افتخار عارف

غالب، انیس اور اقبال کے نقشِ قدم پر

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ مددوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں
غالب

بالیدہ ہوں ، وہ اونج مجھے آج ملا
ظلِ علمِ صاحبِ معراجِ ملا
منبر پہ نشدت ، سر پہ حضرت کا علم
اب چاہیے کیا ! تختِ ملا ، تاجِ ملا
انیس

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہِ دانشِ فرنگ
سرمهہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
اقبال

ترتیب

الف

اشFAQ حسین

پیش لفظ

باب یقین

۳

مکالمہ

۵

حباب شب میں تب وتاب خواب رکھتا ہے

۷

فاذ کرونی اذگر کم

۹

یا سریع الرضا اغفر لمن لا یملک الالدعا

۱۱

مراشر کر تو مجھے جواز افتخار دے

۱۲

مدحت شافع محسن پر مقرر رکھا

۱۳

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبراء تھا

۱۴

دل و نگاہ کی دُنیائی نئی ہوئی ہے

۱۵

عہد میثاقِ ازل، خلق میں ذہرا تا کون

- ۱۸ سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے
۲۰ دلوں کے ساتھ جیسیں جو خم نہیں کرتے
۲۱ بلاں ویوْ ذرُّ سلمانؑ کے آقاً ادھر بھی
۲۲ جو میں نہیں کر سکا مرے ہم قلم کریں گے
۲۳ بظرِ زِ مختلفِ آک نعت لکھنا چاہتا ہوں
۲۵ اپنے آقاً کے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
۲۶ مدینہ ونجف و کربلا میں رہتا ہے
۲۷ شہرِ علم کے دروازے پر
۲۹ فتکَلَمُوا تَعْرُفُوا
۳۱ شرف کے شہر میں ہر بام وَ حسینؑ کا ہے
۳۲ کر بلا کی خاک پر کیا آدمی سجدے میں ہے
۳۳ کر بلا گواہی دے
۳۷ میانِ تیغ و سناء، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
۳۹ ذکرِ مظلوم کو انعام میں رکھا گیا ہے
۴۰ حسین! تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
۴۱ نمازِ عشق کی تفسیر بن گیا تراغم
۴۲ هل جزا الْاحسان الْا الْاحسان

۳۳

تعارف

۳۴

مظہر خوشنودی دا اور علم عباس کا

۳۶

اے زمینِ کربلا اے آسمانِ کربلا

۳۷

زرِ صبر سے پیکاں ستم کھینچتے ہیں

۳۹

ابو طالبؑ کے بیٹے

۴۱

ابوذر غفاریؑ کے لیے ایک نظم

۴۲

اسامہ بن زیدؑ کے نام ایک نظم

۴۳

آئینہِ انہا حسنؑ ہیں

۴۵

نہ معجزہ ہے کربلانہ حادثہ ہے کربلا

۴۶

صدائے استغاشہ

۴۸

شامِ غریبیاں

۴۹

عہدِ امانت سرنوشت میں شامل تھا

۵۰

نہ مال وزر ہے نہ جاہ و حشم ہمارا ہے

۵۱

قرآن حق ہے اور نبی حق کے ساتھ ہے

۵۲

سند پر مہرِ ختمی مرتبتؑ اے دل مبارک

۵۳

یہ میرے لفظ جو کچھ آب و تاب رکھتے ہیں

۵۵

العلمُ حجَّابُ الْأَكْبَرُ

۶۶

وارثِ احمدِ مختار ہے آنے والا

۶۷

مرے خدا مرے لفظ و بیان میں ظاہر ہو

۶۸

مالک نے جو چاہا تو اجازت ہمیں ہو گی

۶۹

مالک درد کو محکم رکھنا ایک ہی غم کے ساتھ

باب بازگشت

۷۳

اب اس میں کا وش کوئی نہ کچھ اہتمام میرا

۷۵

ہم ابلِ جبر کے نام و نسب سے واقف ہیں

۷۶

کسی ابلِ بحر کی بدُعا ہے کہ ہو دسری کا قصور ہے

۷۷

اعلان نامہ

۷۸

ایک رخ

۷۹

انْ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا

۸۰

ھل من ناصرا ینصرنا

۸۱

انی کُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ

۸۲

فارسی طغرا

۸۳

ایک سوال

۸۴

منظر سے ہیں نہ دیدہ بینا کے دم سے ہیں

- ۸۵ میرا مالک جب توفیق ارزانی کرتا ہے
۸۶ سیلِ جنوں ساحل کی جانب آتا ہے
۸۷ مالک! یہ آب و خرمایہ نان و نمک نہ دے
۸۸ غبارِ دشت طلب زیادہ ہے تو جنوں میں زیادہ ہو جا
۸۹ خوب بہا
۹۱ وہی پیاس ہے وہی دشمن ہے وہی گھر انہی ہے
۹۲ پس گردِ جادہ درد نور کا قافلہ بھی تو دیکھتے
۹۳ کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
۹۴ اب بھی تو بین اطاعت نہیں ہو گی ہم سے
۹۵ ملے تو کیسے ملے منزلِ خزینہ خواب
۹۷ گلی کو چوں میں ہنگامہ پا کرنا پڑے گا
۹۸ شہر گل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
۹۹ یہ معجزہ بھی کسی کی دعا کا لگتا ہے
۱۰۰ نہ مو دنور ہے اور غیب سے شہود میں ہے
۱۰۱ آخری آدمی کا رجز
۱۰۳ دولتِ نغمہ و آہنگ و فغاں میری ہو
۱۰۴ میں چاہتا تھا کہ سورج مری گواہی دے

باب تصدیق

- | | | |
|-----|----------------------------------|--|
| ۱۰۷ | پروفیسر فتح محمد ملک | افتخار عارف کا کارنامہ خاص |
| ۱۰۹ | پروفیسر گوپی چند نارنگ | санحہ کر بنا بطور شعری استعارہ..... ایک اقتباس |
| ۱۲۲ | پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشانی | افتخار عارف کی نعمت |

پیش لفظ

یہ 1982ء کے موسمِ خزان کی بات ہے، ٹورنٹو میں پہلی بار ایک عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی مشاعروں کا بھی سلسلہ تھا جو کینیڈا اور امریکہ کے مختلف شہروں تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی سلسلے کا ایک مشاعرہ لاس انجلس میں ہونے والا تھا جہاں لندن سے افتخار عارف کے علاوہ احمد فراز بھی مدعو تھے جو ان دونوں لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لاس انجلس کے اس مشاعرے میں مجھے بھی ٹورنٹو سے مدعو کیا تھا اور ہم تینوں مہمانوں کا قیام سید محمد جعفری مرحوم کے فرزند احمد جعفری کے گھر پر تھا۔ احمد ان دونوں اکیلے ہی رہتے تھے اور انہیں صبح بہت ہی سوریے دفتر جانا پڑتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ چلواب تمہارے آنے سے ایک مسئلہ تھا ہو گیا کہ کم از کم مہمانوں کو صبح کا ناشستہ وقت پر مل جایا کرے گا۔ رات کو ہم لوگ کھانے سے واپس آئے تو احمد جعفری فوراً سونے چلے گئے اور ہم لوگ بڑی دریتک باقیں کرتے رہے۔ غالباً صبح تین ساڑھے تین بجے کے قریب ہم بھی سونے چلے گئے اور میرا خیال تھا کہ اب ہم تینوں بہت اطمینان سے دریتک سونے کے بعد اٹھیں گے مگر صبح معاملہ اس کے بالکل بر عکس نکلا۔ یعنی جو اصل مہماں تھے وہ خود اپنے لیے چائے والے بنائے کر پی چکے تھے اور میرے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب افتخار نے میرے منہ پر پانی کا چھڑکا دکیا اور کہا ابے اشغال اب اٹھو بھی، کب سے جگا رہے ہیں تم کو، تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی مہماں علی اصلاح اٹھنے کے عادی ہیں۔ ایک چہل قدمی کے لیے اور دوسری اول وقت نمازِ فجر کے لیے۔ یہ دوسری شخصیت افتخار عارف کی تھی۔

افتخار عارف کی شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے مذہبی استعاروں سے تو سب ہی واقف تھے لیکن ان کے اشائیل اور شاندار طرزِ زندگی کے سبب جوانہیں اس وقت "لبی سی آئی" کے ایک اعلیٰ عہد بیدار، ٹی وی کی ایک اہم شخصیت اور ایک مقبول شاعر کی حیثیت سے حاصل تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کوشاید یہ خیال تک نہ آتا ہوگا کہ اس خوش لباسی اور ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے کوئی ایسا پیوند بھرا پیرا ہن بھی ہے جو فقیروں اور دردیشوں ہی کے بدن پر بجتا ہے۔ میری طرح کچھ اور بھی ایسے لوگ تھے جنہیں اُس وقت تک ان کے بہت زیادہ قریب رہنے کا موقع نہیں ملا تھا وہ بھی غالباً اس خیال کے تھے کہ افتخار کا یہ مذہبی روایہ اور صوفیانہ انداز صرف شاعری برائے شاعری کے دائرے تک ہی محدود ہے اور اس کا تعلق زندگی کے اصل دھاروں سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تاثر اس گفتگو سے اور بھی ملتا تھا کہ جوان کی صحبت میں اکثر و بیشتر ہوا کرتی تھی۔ وہ محفل یاراں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ جان اگر جاتی ہے تو جائے مگر کوئی جملہ بیکار نہ جائے۔ مجھے اُس وقت تک ان کے ساتھ جن محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا، عموماً ان محفلوں میں موسیقی، کتابوں، فلموں، کرکٹ، سیاست اور زیادہ تر شعرو ادب کا، ہی چرچا رہا کرتا تھا۔ لاس انجلس کی اُس صحیح مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرا تو اس عابدِ شبِ زندگہ دار اور اول وقت نمازِ صحیح پڑھنے والے افتخار عارف سے مکمل تعارف ہی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے یہ مشہور ہے کہ اگر کسی کو پرکھنا ہو تو اُس کے ساتھ سفر کرو۔ مجھ پر بھی اس سفر کے دوران بہت سا وقت ایک ساتھ گزارنے ہی کی بنا پر افتخار عارف کی شخصیت کے بہت سے گوشے منکشف ہوئے۔ ایسا صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ افتخار عارف کے حوالے سے کچھ اور لوگوں کو بھی مختلف موقعوں پر اس سے ملتی جلتی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ایک جگہ ممتاز مفتی نے بھی اُن کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں کسی اور حوالے سے ایسی ہی ایک بات لکھی تھی کہ ”لوگ سمجھتے ہیں کہ افتخار عارف کی باتیں پھل بھڑیاں ہیں۔ میں بھی اسی خوش نہیں میں بتتا تھا

پھر ایک دن دل کے اشوکا ہوٹل میں مجھ سے فاش غلطی سرزد ہو گئی۔ اس کا انٹرو یو یونے کے لیے میں نے اسے چھیر دیا۔ بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا۔ انتقاماً اس نے اپنی آپ بتی چھیر دی۔ ایک دم منظر بدل گیا۔ پُروا چلنے لگی۔ گھور گھٹا میں چھا گئیں۔ افتخار یوں موسلا دھار بر سا کہ نہ افتخار عارف رہانہ ممتاز مفتی، نہ اشوکا ہوٹل رہانہ دلی۔ سب پانی پانی ہو گیا، سب ڈوب گئے۔ تب میں نے جانا کہ قدرت کنوں کا پھول کھلانے کے لیے پہلے جھیل بناتی ہے، چھل چھل چھلچھلانی جھیل، گلب کا پھول کھلانے کے لیے پہلے کا نئے لگاتی ہے،“ ممتاز مفتی نے یہ جانے کے بعد ہی افتخار کی شخصیت کو دو منزلوں میں تقسیم کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ”شہرت کی چاندنی میں افتخار عارف خوب خوب نہایا۔ انداز میں وحشتیں جا گیں Who cares“، ہٹاؤ چھوڑو کے روئے ظاہر ہوئے۔ محبوبیت نے لشکارے مارے، سب کچھ ہوا لیکن یہ سب کچھ اور پر کی منزل میں ہوا، نیچے کی منزل میں وہی لاوارثی کا اندر ہیرا، دُکھ کی بھیگ، تلخ یادوں کے مکڑے جالے تختے رہے۔“ ممتاز مفتی نے دو منزلوں کی طرف تو واضح اشارہ کر دیا، مگر ان دونوں منزلوں سے نیچے بھی ایک منزل ہوتی ہے جسے تھانہ یا ہمارے شماں امریکہ میں بیسمنٹ Basement کہا جاتا ہے۔ یہاں باہر کی روشنی کم کم ہوتی ہے لیکن اندر کی چاندنی ہر بُن مُو سے ٹکتی ہے۔ افتخار عارف کی مذہبی شخصیت یہیں سے اکتسابِ نور کرتی ہے۔ یہ ان کی اپنی ذات کا غارِ حرا ہے اور یہیں ان کی تخلیقی شخصیت کا وہ پہلو جملہ گاتا ہے جس کے بارے میں خود انہوں نے کہا ہے کہ:

مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

یہ جو ایک خاص وضع کی آب و ہوا ہے، یہ رثائی ادب کی تخلیق کی ضمانت ہے اور اس کا اظہار کوئی نیا نہیں ہے، جن زبانوں سے مسلمانوں کا سابقہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال سے رہا ہے، ان سب میں رثائی ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اردو میں خصوصیت کے ساتھ یہ روایت بہت گہری اور جاندار ہی ہے۔

رثائی ادب کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں رسمی نقش و نگار کافی نہیں ہوتے، بلکہ جب تک اس میں عشق اور سرشاری کی کیفیت شامل نہ ہو اس کے سارے نقش پانی پر بنے ہوئے نقش ہی ثابت ہوتے ہیں۔ جب تک دل میں عقیدت کے دریا ٹھاٹھیں نہ مار رہے ہوں اور عشق کی چنگاری نہ لگی ہو، اُس وقت تک نہی شاعرانہ مہارت کلام میں کوئی تاثیر پیدا نہیں کر سکتی۔ انہیں اور اقبال اور ان کے قبلے کے سینکڑوں شاعروں کا کلام عقیدت کے انہی سرچشمتوں سے سیراب ہونے کی وجہ سے ہی زندہ جاوید ہے۔ ہمارے دور میں افتخار عارف بھی اسی قبلے کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں مگر ذرا ایک منفرد انداز سے۔

”مہرِ دونیم“ کی اشاعت سے قبل ہی ان کے لمحے کی انفرادیت نے جو اپنے مختلف رنگ دکھلانے شروع کر دیے تھے۔ ان میں سے ایک رنگ، کربلا کے استعارے سے بھی سُرخی لے رہا تھا۔ افتخار عارف کی شاعری کا بنیادی خمیر شروع سے ہی رثائی ادب کی روایتوں سے اپنارشتہ جوڑ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے میں شائع ہونے والے دونوں تعارضی مضمایں میں فیضِ احمد فیض اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کی طرف باقاعدہ توجہ دلوائی تھی۔

فیض نے ان کے بارے میں یوں ہی تو نہیں کہا تھا کہ انہوں نے ”جدید مضمایں و مطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کسب فیض کیا ہے کہ تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز و کناہ کا نیاسامان پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق و طلب، ایثار و جاں فروشی، جبر و تعددی کا بیان صرف منصور و قیس اور فرہاد و جم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب گھر میں دار و رسن کی بات چلی تو مسیح و صلیب کے حوالے بھی آ گئے، لیکن المیہ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام اور مرثیے تک محدود رہا۔ صرف اقبال کی نگاہ وہاں تک پہنچی۔

خونِ حسین بازدہ کوفہ و شام خویش را

یا

قالہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

افتخار عارف نے گزارش احوال واقعی کے لیے اس مآخذ سے بہت اثر آفرین اور خیال افروز کام لیا ہے۔ اسی طرح نارنگ صاحب نے بھی ”مہرِ دونیم“ کے پیش لفظ میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ افتخار عارف (اپنی شاعری میں) بار بار جس شہر کا حوالہ لاتے ہیں وہ اردو کی تخلیقی اور ثقافتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا ظلم و استبداد کا کہیں کوئی قدیمی نشان تو نہیں ہے؟ ان سوالوں کے جوابات ”مہرِ دونیم“ ہی کے صفحات پر موجود تھے جب کہ ”حرفِ باریاب“ اور ”جہاں معلوم“ نے اس پر مزید گہری مہر ثبت کر دی۔ پھر یہ خوبصورت ان کتابوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دریاؤں، سمندروں اور ملکوں کی سرحدوں کو چیرتی ہوئی دلوں تک پہنچ گئی۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب سے چند برس قبل نیوجرسی کی ایک ایسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں رثائی ادب کا چراغ پورے آب و تاب سے فروزاں تھا۔ اس محفل کے میزبان جناب جعفر نقوی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے بڑی عجز و انکساری سے کہا کہ میں خود تو شاعر نہیں ہوں، لیکن میرا بہت جی چاہتا ہے کہ آج کی اس محفل کا آغاز اپنے ایک پسندیدہ شاعر کے کلام سے کروں اور پھر انہوں نے یہ چند خوب صورت اشعار نذرِ رسما میں کیے۔

شرف کے شہر میں ہر بام و دارِ حسین کا ہے
زمانے بھر کے گھر انوں میں گھرِ حسین کا ہے
فراتِ وقتِ رواں دیکھ سوئے مقتل دیکھ
جو سر بلند ہے اب بھی وہ سرِ حسین کا ہے
زمیں کھا گئی کیا کیا بلند و بالا درخت
ہرا بھرا ہے جواب بھی شجرِ حسین کا ہے

سوال بیعت شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسین کا ہے
کہاں کی جنگ کہاں جا کے سر ہوئی ہے کہ اب
تمام عالم خیروخبر حسین کا ہے
محبتوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو مرے حال پر حسین کا ہے
حضور شافعؑ محشر علیؑ کہیں کہ یہ شخص
گناہ گار بہت ہے مگر حسین کا ہے

جعفر نقوی صاحب نے ان اشعار کو بہت خوب صورت لجھ میں تحت اللفظ کے ساتھ سنایا اور حاضرین
محفل نے ہر ہر شعر پر خوب خوب داد دی۔ ان اشعار کے خالق کا نام ہی نہیں بلکہ اس محفل میں موجود
تقریباً سمجھی کو اس ”سلام“ کے اشعار تک یاد تھے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت تک جعفر
صاحب کی افتخار عارف سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے اور پھر ایک بار جعفر
نقوی اور ان کی بیگم زہر نقوی صاحبہ نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں افتخار عارف کے صرف مذہبی
کلام کا ایک انتخاب مرتب کر دوں جسے میں نے بخوبی قبول کر لیا۔ اس میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی
کیوں کہ ان کا بیشتر کلام ان کے تینوں مجموعہ ہائے کلام میں شامل تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ یہ سب کلام ان کی
نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ شائع ہوا تھا۔ چنانچہ وہ احباب جو صرف ان کا رثائی کلام پڑھنا چاہتے
ہیں، ان کے ذوق کی تسلیم کے لیے شاید یہ کتاب کچھ وجہ طہرانیت ہو۔ اگر ایسا ہو سکے تو میں سمجھوں گا کہ
اس طرح نہ صرف یہ کہ جعفر صاحب اور ان کی بیگم زہر اصلاحیہ کی خواہش پائی تکمیل کو پہنچ سکے گی بلکہ خود مجھے

بھی بے انتہا خوشی ہوگی۔

”شہر علم کے دروازے پر“ میں ان کے تینوں مجموعوں کے علاوہ ایسا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے جو مخفیوں اور مجلسوں میں پڑھا گیا۔ اس کے لیے میں افتخار عارف صاحب کا بہت ہی شکرگزار ہوں۔ افتخار عارف کی ذاتی درخواست پر ممتاز دانشور اور سیاسی مدرس اور میں الاقوامی شہرت کے حامل مصوّر جناب حنیف رامے نے کتاب کے لیے خوبصورت سرورق بنایا جس کے لیے شاعر کے ساتھ ساتھ ہم سب ان کے احسان مند ہیں۔ ممتاز و مایہ ناز ادیب انتظار حسین اور منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر نصیر ترابی نے کتاب کے لیے اپنے تاثرات عطا فرمائے، ان کا شکریہ بھی ہم سب پر واجب آتا ہے۔ مکتبہ دانیال کی حوری نورانی صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جنہوں نے بہت اہتمام کے ساتھ افتخار عارف کے تمام مجموعے شائع کیے اور اس مرتب شدہ کتاب کو بھی شائع کرنے کی زحمت فرمائی۔ آخر میں ایک بار پھر میں جعفر نقوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ ان کی خواہش اور اصرار کے سبب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اشفاق حسین

ٹورنٹو۔ ۲۰۰۵ء

بَابِ يقْيَن

مکالمہ

”ہوا کے پردے میں کون ہے جو چراغ کی رو سے کھیلتا ہے،“
کوئی تو ہوگا

”جو خلعتِ انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے،“
کوئی تو ہوگا

”جواب کو رمزِ نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا“

”کوئی نہیں ہے
کہیں نہیں ہے

یہ ہوش یقینیوں کے، خوشگمانوں کے واہمے ہیں جو ہر سوالی سے بیعتِ اعتبار لیتے ہیں
اس کو اندر سے مار دیتے ہیں“

”تو کون ہے وہ جو لووحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثابت کرتا ہے اور بادلِ اچھاتا ہے
جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خُورشید ڈھالتا ہے
وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کے امکان رکھنے والا

وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کے سامان رکھنے والا
نہیں کوئی ہے
کہیں کوئی ہے
کوئی تو ہو گا،

حباب شب میں تب و تابِ خواب رکھتا ہے
درُون خواب ہزار آفتاًب رکھتا ہے

کبھی خزان میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے رنگ و آب رکھتا ہے

کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اسی پہ بنائے عذاب رکھتا ہے

کبھی یہ کہتا ہے سورج ہے روشنی پہ گواہ
کبھی اسی پہ دلیلِ حباب رکھتا ہے

کبھی فغا کی طرح رایگان اثاثہ حرف
کبھی دعا کی طرح مُستجب رکھتا ہے

کبھی برستے ہوئے بادلوں میں پیاس ہی پیاس
کبھی سراب میں تاثیر آب رکھتا ہے

بشارتوں کی زمینیں جب آگ اُگلتی ہیں
اس آگ ہی میں گل انقلاب رکھتا ہے

میں نے بھی جن کو اپنے دشمنوں کے مقابلے میں
کوئی دلیل نہیں ملے آپ کو بھی میرے
میں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں
کوئی دلیل نہیں ملے آپ کو بھی میرے

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ

(تو تم یاد رکھو مجھ کو، میں یاد رکھوں گا تم کو)

پچھے شعر مکہ مکرمہ کے لیے

منزل ذکر میں ہر شہر پہ چھائے ہوئے شہر
کیا شنا ہو تری قرآن میں آئے ہوئے شہر

میرے آقاوں کے مسکن، مرے اللہ کے گھر
میرے نبیوں کی ذعاؤں میں بسائے ہوئے شہر

زمزم و کوثر و تنیم، تسلسل تیرا
چشمہ خیر کا فیضان اٹھائے ہوئے شہر

زخم سرکارِ دو عالم کے پلٹنے کی تھی دیر
قبلہ رُو ہو گئے سب راہ پہ آئے ہوئے شہر

ایں بُتے ن ابانت خ ایو پر
اے مردِ بارش یعنی نہایت ہوئے شہم
نے س تھم کب افکار ہوئی جن سے سب
آن ن آوارت آوار ملائے ہوئے شہم

يَا سَرِيعُ الرَّضَا اغْفِرْ لِمَنْ لَا يَمْلِكُ الْاَلْدُعا

اے جلدی راضی ہو جانے والے (میرے معبد) مجھے بخش دے، میرے پاس کوئی پونچی نہیں ہے بجز دعا کے (امام علی)

یہ ذ نیا اک سور کے گوشت کی ہڈی کی صورت
کوڑھیوں کے ہاتھ میں ہے
اور میں نان و نمک کی جستجو میں در بدر قریبہ قریبہ مارا مارا پھر رہا ہوں
ذ راسی دیر کی جھوٹی فضیلت کے لیے
ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں ہر قدم پر منزل عز و شرف
سے گر رہا ہوں
اور مری انگلشتری پر یا علی لکھا ہوا ہے
مگر انگلشتری پر یا علی کندہ کرا لینے سے کیا ہو گا کہ دل تو
مر جبوں کی دسترس میں ہے
مسلسل نرغہ حرص و ہوس میں ہے
(عجب عالم ہے آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل سینوں میں
اندھے ہو چکے ہیں)
اور ایسے میں کوئی حرفِ ذ عا ک خواب بنتا ہے
کبھی سلمان آتے ہیں

بَلْ لَمْ يَرَهُ إِنْ كَانَ فِي أَنْجَانٍ
أَوْ فِي سَمَاءٍ مُّسَمَّدٍ
أَوْ فِي أَعْمَانِ الْأَرْضِ
أَوْ فِي أَعْلَى السَّمَاوَاتِ
أَوْ فِي أَعْقَلِ الْأَنْجَانِ
أَوْ فِي أَعْلَى السَّمَاءِ
أَوْ فِي أَعْلَى السَّمَاءِ
أَوْ فِي أَعْلَى السَّمَاءِ

مرا شرف کہ تو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃِ اعتبار دے

میں جیسے تیسے ٹوٹے پھوٹے لفظِ گھڑ کے آگیا
کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے سنوار دے

مرے امین آنسوؤں کی نذر ہے قبول کر
مرے کریم اور کیا ترا گناہگار دے

نگاہداریِ بہارِ آرزو کے واسطے!
ہمارے خل جاں کو بھی کوئی نگاہدار دے

ترے کرم کی بارشوں سے سارے باغ کھل اٹھیں
ہوائے مہرِ نفترتوں کا سارا زہر مار دے

قیامتیں گزر رہی ہیں کوئی شہسوار بھیج
وہ شہسوار جو لہو میں روشنی اُتار دے

وہ آفتاب بھیج جس کی تابشیں ابد تلک
میں دادِ خواہِ اجر ہوں جزائےِ انتظار دے

مدحت شافعؒ محسن پر مقرر رکھا
میرے مالک نے مرے بخت کو یا اور رکھا

میں نے خاکِ درِ حسنانؑ کو نرمہ جانا
اور ایک ایک سبق نعمت کا آزبر رکھا

میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا
نور کو دائرۂ نور کے اندر رکھا

نورِ مطلق نے اسے خلق کیا خلق سے قبل
منصبِ کارِ رسالت میں مؤخر رکھا

معنیِ اجرِ رسالت کو سمجھنے کے لیے
زیرِ نگرانی سلمانؓ و ابوذرؓ رکھا

خاتمیت کا شرف آپؐ کو بخشنا اور پھر
آپؐ کی دسترسِ خاص میں کوثر رکھا

جس کسی نے بھی کبھی شان میں گستاخی کی
ابد آباد تک اُس شخص کو ابتر رکھا

تختی لکھی تو اسی نام سے آغاز کیا
جس کو معبود نے ہر نام سے اوپر رکھا

منزل شکر کہ ہر گام ، خوشی ہو کہ الہم
ورد اک اسم گرامی کا برابر رکھا

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بے شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی در پر رکھا

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا

مثالِ فردِ عصیاں تھی کتابِ عمرِ رفتہ
کوئی مجھ میں تھا جو صفحےِ الٹتا جا رہا تھا

بلا وے پر یقین تھا اور قدمِ اٹھتے نہیں تھے
عجب سیلِ الْم آنکھوں میں اُمّا آ رہا تھا

ہر اک بولا ہوا جملہ، ہر اک لکھا ہوا لفظ
لہو میں گونجتا تھا اور قیامتِ ڈھا رہا تھا

اور ایسے میں اُسی اک نام نے کی دستگیری
وہی جو منتها ہر ذعا بنتا رہا تھا

بہت نامطمئن آنکھیں اچانک جاگ اٹھیں
کوئی جیسے دلِ کم فہم کو سمجھا رہا تھا

مدینہ سامنے تھا ، منتظر تھا در بخی کا
دل آزردہ اپنے بخت پر اترا رہا تھا

ذعا بعد از ذعا ، سجدہ بہ سجدہ ، اشک در اشک
میں مشت خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا

دل و نگاہ کی دُنیا نئی نئی ہوئی ہے
درود پڑھتے ہی یہ کیسی روشنی ہوئی ہے

میں بس یونہی تو نہیں آ گیا ہوں محفل میں
کہیں سے اذن ملا ہے تو حاضری ہوئی ہے

جہان گن سے ادھر کیا تھا کون جانتا ہے
مگر وہ نور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے

ہزار شکر غلامان شاہ بطحی میں
شروع دن سے مری حاضری لگی ہوئی ہے

بہم تھے دامنِ رحمت سے جب تو چین سے تھے
جدا ہوئے ہیں توابِ جان پر بنی ہوئی ہے

یہ سر اٹھائے جو میں جا رہا ہوں جانبِ خلد
مرے لیے مرے آقانے بات کی ہوئی ہے

مجھے یقیں ہے وہ آئیں گے وقت آخر بھی
میں کہہ سکوں گا زیارتِ ابھی ابھی ہوئی ہے

عبد میشاق ازال، خلق میں ذہاتا کوں
میرے سرکار نہ بھاتے تو بھاتا کوں
نسبت یعنی قدم کرنی یہ بودھم
وو نہ ہوت تو مدین کی طرف جاتا کوں
دو کمانوں سے بھی کم، منزل سدروت اور ان
ایک عالم بے اس عالم کی خبر اتا کوں
آن کی آواز سے اوپنی نہ ہو کوئی آواز!
مالک الملک نہ فرمات تو فرماتا کوں
پاس نسبت نہ بہت رہک کے رکھا ورنہ
فرود عصیاں کی طرف دیکھ کے شرماتا کوں
جن کی خوشنودی خاطر سے ہے نعمت مشروط
آن کے درچھوڑ کے اوروں کی طرف جاتا کوں

سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے
اک عبدِ مولیٰ صفات ہے اور روشنی ہے

کتاب و کردار ساتھ ہے اور روشنی ہے
دُرود جزو صلوٰۃ ہے اور روشنی ہے

میانِ معبود و عبدِ میثاقِ نور کے بعد
نظر میں بس ایک رات ہے اور روشنی ہے

حضورِ غارِ حرا سے بیت الشرف میں آئے
بس اک یقین ساتھ ساتھ ہے اور روشنی ہے

حضورِ مکے سے جا رہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب گل کائنات ہے اور روشنی ہے

حضورِ مکے میں آرہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب ہی میں نجات ہے اور روشنی ہے

رفیق اعلیٰ کا حکم ہے اور کتاب دائم
اب تک اب ان کی ذات ہے اور روشی ہے
علمی افتخار عارف چ مہر خاتم
ثبوت فرد نجات ہے اور روشی ہے

ڈاول کے ساتھ جیسیں جو خم نہیں کرتے
وہ پاس مدت خیر الامم نہیں کرتے

ذنا بغير، اجازت بغير، اذن بغير
ہم ایک لفظ سپر و قلم نہیں کرتے

کتاب حق نے جنہیں مصطفیٰ قرار دیا
جز آن کے اور کوئی ذکر ہم نہیں کرتے

کریم ایسے کہ انعام کرتے جاتے ہیں
جواد ایسے کہ نعمت کو کم نہیں کرتے

جو آن کے جادہ رحمت سے منحرف ہو جائیں
زمانے آن کو کبھی محترم نہیں کرتے

میسر آتی ہے جن کو درود کی توفیق
کسی بھی حال میں ہوں کوئی غم نہیں کرتے

نظر میں طائف و مکہ رہیں تو آن کے غلام
جواب میں بھی ستم کے، ستم نہیں کرتے

بلال و بُوذر و سلمان کے آقا ادھر بھی
بدل جاتی ہے جس سے دل کی دُنیا وہ نظر بھی

میں بسم اللہ لکھ کے جب بھی لکھتا ہوں محمد
قلم قرطاس پر آتے ہی جھک جاتا ہے سر بھی

حرم سے مسجد الاقصی ادھر سدرہ سے آگے
مسافر بھی عجب تھا اور عجب تھی ریگز ر بھی

محمد کے خدا جب بھی کبھی مشکل کا وقت آئے
دُعا کو ہات انھیں اور دُعا میں ہوا شر بھی

بحقِ کفش برداران دربار رسالت
شاخوانوں میں شامل ہو گیا اک بے ہنر بھی

میں پہلے بھی مشرف ہو چکا ہوں حاضری سے
خدا چاہے تو یہ نعمت ملے بارِ دگر بھی

جو میں نہیں کر سکا مرے ہم قلم کریں گے
بصورتِ نعت استغاثہ رقم کریں گے

حضوری و حاضری کے آداب جانتے ہیں
درِ مطہر پہ گفتگو کم سے کم کریں گے

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے مسلک ہوں
سو میں جہاں بھی رہوں گا مجھ پر کرم کریں گے

وہ پاکِ مٹی جوان کے قدموں سے مس ہوئی ہے
ندامتوں کے ہزار اشکوں سے نم کریں گے

خدا جو توفیق دے تو طیبہ کی ہر گلی میں
درُودِ پیغم سے جسم و جاں تازہ دام کریں گے

بطریزِ مختلف اک نعت لکھنا چاہتا ہوں
میں ساری نعمتیں اک ساتھ لکھنا چاہتا ہوں

مرا معبد خود توفیق ارزانی کرے گا
میں وصفِ سرِ موجودات لکھنا چاہتا ہوں

حضور اور محترم وابستگان شبر حکمت
میں اس بستی کے سب حالات لکھنا چاہتا ہوں

بہت براہم بہت ہی منتشر اور اراقِ جاں پر
جہاں تک سائنس ہے اثبات لکھنا چاہتا ہوں

دل و ذِنیا مجھے آواز دیتے ہیں بیک وقت
میں جب بھی صورتِ حالات لکھنا چاہتا ہوں

نہ تفسیرِ طسم و اسم ہے موضوعِ میرا
نہ تفسیرِ صفات و ذات لکھنا چاہتا ہوں

نہ استدراک کی معیار بندی میرا منصب
نہ میں ترتیب استنباط لکھنا چاہتا ہوں

حضورِ سید و سردار جو تو قیر پا جائیں
وہی حرفِ شرفِ دن رات لکھنا چاہتا ہوں

اپنے آقا کے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
دل الجھتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اب یہ دنیا جسے چاہے اُسے دیکھے سریل
ہم تو بس ایک سفینے کی طرف دیکھتے ہیں

عبد آسود گی جاں ہو کہ دور ادبار
اُسی رحمت کے خزینے کی طرف دیکھتے ہیں

وہ جو پل بھر میں سر عرش بریں گھلتا ہے
بس اُسی نور کے زینے کی طرف دیکھتے ہیں

بیر تصدیق سند نامہ نسبت عشق
مُبر خاتم کے نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھے ہیں وہ آشقة مزاج
جو حرم سے بھی مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

مرے وجود سے باہر بھی ہے کوئی موجود
جو میرے ساتھ سلام و شنا میں رہتا ہے

میسر آتی ہے جس شب قیام کی توفیق
وہ سارا دن مرا، ذکرِ خدا میں رہتا ہے

غلامِ بوذرُؑ و سلمانؓ دل، خوشی ہو کہ غم
حدودِ زاویۃِ هل اتسی میں رہتا ہے

دُرود پہلے بھی پڑھتا ہوں اور بعد میں بھی
اسی لیے تو اثر بھی دُعا میں رہتا ہے

نکل رہی ہے پھر اک بار حاضری کی سبیل
سو کچھ دنوں سے دل اپنی ہوا میں رہتا ہے

شہرِ علم کے دروازے پر

کبھی کبھی دل یہ سوچتا ہے
نہ جانے ہم بے یقین لوگوں کو نامِ حیدر سے ربط کیوں ہے
حکیم جانے وہ کسی حکمت سے آشنا تھا
شجع جانے کہ بدروخیبر کی فتحِ مندی کا راز کیا تھا
علیم جانے وہ علم کے کون سے سفینوں کا نأخذ اتنا
مجھے تو اس صرف یہ خبر ہے
وہ میرے مولا کی خوشبوؤں میں رچا بسا تھا
وہ ان کے دامنِ عاطفت میں پا بڑھا تھا
اور اس کے دن رات میرے آقا کے چشم واپر و جنبشِ لب کے منتظر تھے
وہ رات کو دشمنوں کے زرنخ میں سور ہاتھا تو ان کی خاطر
جدال میں سر سے پاؤں تک سرخ ہور ہاتھا تو ان کی خاطر
سواس کو محبوب جانتا ہوں
سواس کو مقصود مانتا ہوں

سعادتیں اس کے نام سے ہیں
محبتیں اس کے نام سے ہیں
محبتوں کے سچی گھرانوں کی نسبتیں اس کے نام سے ہیں

فَتَكَلَّمُوا تُعْرَفُوا

کلام کروتا کہ پہچانے جاؤ (امام علی)

دعوت، بحیرت
بدر، أحد، خیبر، خندق ایک ایک ورق پر
خطِ جلی سے لکھا ہے اک نام
علیؑ کا نام
علیؑ کے نام کا ورد و وظیفہ کرتے گزری عمر تمام
اول سے آخر تک اسمِ محمدؐ کی تنویر
اعلیؑ، علیؑ، معلیؑ، عالیؑ نور کی اک زنجیر
نور کی اس زنجیر کا حلقة حلقة نور نژاد
طیبہ، نجف، کربلا، مشہد، کاظمین، بغداد
خوٹ، قطب، ابدال، قلندر، سب کی منزل ایک
ذکر، بیان، کلام، عبادت، سب کا حاصل ایک
اس حاصل تک جانے والی لہر کا دریا ایک
اس منزل تک جانے والے شہر کا رستہ ایک

شہرِ نور کے اس رستے کی دھولِ مرائی نعام
دھوت، بھرت، بدر، اُحد، خیبر، خندق، ایک ایک ورق پر
خطِ جلی سے لکھا ہے اک نام، علیؑ کا نام
علیؑ کے نام کا ورد و وظیفہ کرتے گزری عمر تمام

شرف کے شہر میں ہر بام و در حسین کا ہے
زمانے بھر کے گھر انوں میں گھر حسین کا ہے

فراتِ وقتِ رواں ! دیکھوئے مقتل دیکھو
جو سر بلند ہے اب بھی وہ سر حسین کا ہے

زمیں کھا گئی کیا کیا بلند و بالا درخت
ہرا بھرا ہے جواب بھی شجر حسین کا ہے

سوال بیعت شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسین کا ہے

کہاں کی جنگ کہاں جا کے سر ہوئی ہے کہ اب
تمام عالم خیر و خبر حسین کا ہے

محبوتوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو مرے حال پر حسین کا ہے

حضور شافع محسن، علی کہیں کہ یہ شخص
گناہ گار بہت ہے مگر حسین کا ہے

کربلا کی خاک پر کیا آدمی سجدے میں ہے
موت رسوایا ہو چکی ہے زندگی سجدے میں ہے

”وہ جو اک سجدہ علیؑ کا نجح رہا تھا وقت فجر“
فاطمہؑ کا لال شاید اب اسی سجدے میں ہے

سننِ پیغمبرؐ خاتم ہے سجدے کا یہ طول
کل نبیؐ سجدے میں تھے آج اک ولی سجدے میں ہے

وہ جو عاشورہ کی شب گل ہو گیا تھا اک چراغ
اب قیامت تک اسی کی روشنی سجدے میں ہے

حضرتک جس کی قسم کھاتے رہیں گے اہل حق
ایک نفسِ مطمئن اُس دامگی سجدے میں ہے

نوكِ نیزہ پر بھی ہونی ہے تلاوت بعدِ عصر
مصحفِ ناطق تھے خخبرِ ابھی سجدے میں ہے

اس پہ حیرت کیا لرزِ اٹھی زمین کربلا
راکپِ دوشِ پیغمبرؐ آخری سجدے میں ہے

کربلا گواہی دے

کربلا گواہی دے
فاطمہ کی بیٹی نے
باپ کی شجاعت کو
صبر سے بدل ڈالا
بھائی کی رفاقت کا
حق ادا کیا کیسا
کربلا گواہی دے

باب شہر حکمت سے
خیمه گاہ نصرت تک
محضر شہادت تک
کیسے کیسے نام آئے
کیا عجب مقام آئے
حق کی پاسداری کو

فرض جانے والے
راہِ حق میں کام آئے
ساتھ ساتھ تھی نینبُ
کربلا گواہی دے

پھر وہ شام بھی آئی
جب بہن اکیلی تھی
اک سفر ہوا انعام
ریگ گرم مقتل پر
چند بے کفن لاشے
بھائیوں بھیجوں کے
گودیوں کے پالوں کے
ساتھ چلنے والوں کے
ساتھ دینے والوں کے
کچھ جلنے ہوئے خیمے
کچھ ڈرے ہوئے پچے
جن کا آسرا نینبُ
جن کا حوصلہ نینبُ
کربلا گواہی دے

مشہدِ مقدس سے
اک نیا سفر آغاز
جس کی ایک منزل شام
شام شامِ مظلومی
اور وہ خطبہ نینبُ
پھر تو بر سر دربار
بوچھنے لگی دنیا
ظلہم کی کہانی میں
داستاں سراوں کے
حاشیے کہاں تک ہیں
سوچنے لگی دنیا
منبرِ سلوانی کے
سلسلے کہاں تک ہیں
خیر کے تحفظ پر
گھر لٹانے والوں کے
حوالے کہاں تک ہیں
وقت نے گواہی دی
جر کے مقابل میں
صبر کا سبق نینبُ
مصحفِ شہادت کا
آخری ورق نینبُ

یہ جو دردِ محکم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے

یہ جو آنکھ پُر نم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے

یہ جو فرشِ ماتم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے

میانِ تنقیح و سناء ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
حدیثِ شعلہ بجاں ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

مقامِ سجدہ بے اختیار ، بخز تمام
کمالِ حرف بیان ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

جہاں رسول کے نقشِ قدم وہیں پہ علیٰ
وہیں حسین جہاں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

ہر امتحان ، ہر اک ابتلا کی منزل میں
قرارِ دل زدگاں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

شہود و شاہد و مشہود ایک ہوں کہ نہ ہوں
ایمن و امن و اماں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

غبار اڑاتے ہوئے وقت کے مقابل بھی
حصارِ نام و نشاں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

سوال بیعت دربار شام اور حسین
کہاں یزید کہاں لا الہ الا اللہ

کنار آب رواں ، ارتباط مشک و علم
بغان تشنہ لہاں لا الہ الا اللہ

ذکرِ مظلوم کو انعام میں رکھا گیا ہے
ظلم کو زمرةِ دشمن میں رکھا گیا ہے

از ازل تا به ابد سارے یزیدوں کا حساب
ایک ہی دفترِ بدنام میں رکھا گیا ہے

تا قیامت کسی ظالم کو نہ ہو جرأتِ ظلم
صبر کو منزلِ اقدام میں رکھا گیا ہے

کربلا ہو کہ نجف ہو کہ مدینہ سب کو
نور کے سلسلہِ عام میں رکھا گیا ہے

میں نے تقویمِ شہادت پہ نظر کی تو کھلا
خاک کو شیشہِ ایام میں رکھا گیا ہے

صبرِ مخدومہ کو نینُ کی وارثِ زینت
اک نشانی کہ جسے شام میں رکھا گیا ہے

مفخر ہوں تو یہ فیضانِ کرم ہے اُن کا
اُن کی نسبت کو مرے نام میں رکھا گیا ہے

حسین! تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
مگر تمہارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

مدینہ و نجف سے کربلا تک ایک سلسلہ
ادھر جو آگیا وہ پھر ادھر ادھر نہیں رہا

صدائے استغاثہ حسین کے جواب میں
جو حرف بھی رقم ہوا وہ بے اثر نہیں رہا

صفیں جمیں تو کربلا میں بات کھل کے آگئی
کوئی بھی حیله نفاق کارگر نہیں رہا

بس ایک نام ... ان کا نام اور ان کی نسبتیں
جز ان کے پھر کسی کا دھیان عمر بھر نہیں رہا

کوئی بھی ہو کسی طرف کا ہو کسی نب کا ہو
جو تم سے منحرف ہوا وہ معتبر نہیں رہا

نمازِ عشق کی تفسیر بن گیا ترا غم
کبھی فغاں، کبھی سجدہ، کبھی دعا ترا غم

گروہ خاک نشیناں کا آسرا ترا غم
بنا گیا ہے فقیروں کو کیا سے کیا ترا غم

ہزار ظلم کی کوشش کہ ذکر مٹ جائے
مگر بچھی تری فرشِ عزا، رہا ترا غم

حصارِ ظلم کے زرنخے میں سرخوتے لوگ
حدودِ وقتِ معین سے ماورا ترا غم

مقابلِ صفِ اعدا بلند تیرے علم
خیامِ صبر شعاراں کا حوصلہ ترا غم

کشاکشِ دل و دُنیا میں ہم غلاموں نے
ہر ایک چیز گنو دی بچا لیا ترا غم

ہوئی ہے جب بھی صف آرایا پاہ ظلمت و ظلم
کہیں سپر، کہیں شمشیر، بن گیا ترا غم

هل جَرَاءُ الْأَحْسَانِ إِلَّا الْأَحْسَانُ

عجبِ اک سلسلہ ہے
خدیجہؓ فاطمہؓ زینبؓ
وفا کے باب میں، صدق و صفا کے باب میں، صبر و رضا کے باب میں
کیسا منور راستہ ہے
خدیجہؓ فاطمہؓ زینبؓ
طوعِ حرفاً قراءے صدائے استغاثۃ تک
حراسے کر بلا تک
مشیت نے جو اک خطِ جلی کھینچا ہوا ہے
اسی کا نور ہے جودل بہ دل منزل بہ منزل ہر طرف پھیلا ہوا ہے
رسالت کی گواہی ہو، ولایت کی گواہی ہو، امامت کی گواہی ہو
جو یہ کہہ دیں وہی میزانِ حق میں مستند مانا گیا ہے
خدیجہؓ فاطمہؓ زینبؓ
گواہی میں تسلسل اور پھر ایسا تسلسل
آپ خود اپنی جگہ اک معجزہ ہے

خدیجہ اور ابو طالب نے جس منزل سے ناموس رسالت کی
حافظت کی یہ سارا معجزہ اس کی جزا ہے
یہ ہم جو آج بھی ذنیا میں پہچانے گئے ہیں
لائق اکرام گردانے گئے ہیں
انھیں کے در کا صدقہ ہے انھیں کی سب عطا ہے
خدیجہ فاطمہ زینت
عجب اک سلسلہ ہے
وفا کے باب میں، صدق و صفا کے باب میں،
صبر و رضا کے باب میں کیسا منور
راستہ ہے

تعارف

میانِ خالق و مخلوقِ خطِ نورِ احمد
محمدُ خود جسے قرآن فرمادیں وہ قرآن
علتی وہ جن کے چہرے پر نظر کرنا عبادت
نہیں جن کے لیے تعظیم کو انٹھیں وہ زہرا
جو انانِ جناب کے سید و سردار حسین
شجاعت صبر کے پیکر میں داخل جائے تو زینت
وفا امکان سے آگے نکل جائے تو عباس

منظیرِ خوشنودیٰ داورِ علمِ عباس کا
ایک دن لہرائے گا گھرِ گھرِ علمِ عباس کا
کیسا لگتا ہوں میں جب کرتا ہوں مدحِ اہلِ بیت
کیسا لگتا ہے مرے سر پرِ علمِ عباس کا
ہم غلامان درِ مشکل کشا، مشکل کے وقت
چوتے ہیں یا علیٰ کہہ کرِ علمِ عباس کا
کون جانے روزِ عاشورہ فرازِ نور سے
دیکھتے ہوں فاتحِ خیبرِ علمِ عباس کا
اک پھر ریا اک نشانِ خیر اک ننھیٰ سی مشک
ہر دلِ مومن کو آزبر ہے علمِ عباس کا
کاش سُن پاؤں کسی رہوار کے قدموں کی چاپ
دیکھ پاؤں خواب میں اکثرِ علمِ عباس کا
کون جانے آج اسِ جشنِ مبارک کے طفیل
سر پہ لہراتا رہے شبِ بھرِ علمِ عباس کا

اے زمینِ کربلا اے آسمانِ کربلا
تجھ کو یاد آتے تو ہوں گے رفتگانِ کربلا

کر رہے ہیں ذکر ان کے حق کو پہچانے بغیر
سلسلے باطل کے اور زعمِ بیانِ کربلا

کچھ بریدہ بازوؤں والے نے لکھی ریت پر
کچھ کہانی کہہ گیا اک بے زبانِ کربلا

اپنے اپنے زاویے سے اپنے اپنے ڈھنگ سے
ایک عالم لکھ رہا ہے داستانِ کربلا

مصحفِ ناطق تلاوت کر رہا تھا وقتِ عصر
سن رہے تھے خاک پر آسودگانِ کربلا

ٹھوکروں میں ہے شکوہ و شوکت دربارِ شام
کوئی خر کے دل سے پوچھئے عز و شانِ کربلا

استغاثے کی صدا آئی ہے انھو افتخار!
استغاثہ، جس میں شامل ہے اذانِ کربلا

زرہ صبر سے پیکاں ستم کھینچتے ہیں
ایک منظر ہے کہ ہم دم ہم دم کھینچتے ہیں

شہر کے لوگ تو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مہر
ان لکیروں سے عبارت ہے، جو ہم کھینچتے ہیں

حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیتے ہیں سر
اذن ملتا ہے تو شمشیر دو دم کھینچتے ہیں

ان بھی رستوں میں انہی ٹوں سے بھری گلیوں میں
کوئی دن اور کہ ہم لاشئے جم کھینچتے ہیں

آشیانوں کو پلتتے ہوئے طاڑ سر شام
لوحِ امید پ نقشِ غم و ہم کھینچتے ہیں

ہم فقیروں کو تو بس نام خدا کافی ہے
ہم کہاں مت اربابِ حشم کھینچتے ہیں

جن کو رفتار خوش آتی ہو وہ جائیں آگے
ہم لجامِ فرس تیز قدم کھینچتے ہیں

ابوطالب ہی کے بیٹوں کی روایت ہے کہ خیر
جب بھی نرغے میں ہو شمشیرِ دودم کھینچتے ہیں

ابوطالب کے بیٹے

جبین وقت پر لکھی ہوئی سچائیاں روشن رہی ہیں
تا ابد روشن رہیں گی

خدا شاہد ہے اور وہ ذات شاہد ہے کہ جو وجہ اساسِ نفس و آفاق ہے
اور خیر کی تاریخ کا وہ بابِ اول ہے
ابد تک جس کا فیضانِ کرم جاری رہے گا
یقین کے آگئی کے روشنی کے قافلے ہر دور میں آتے رہے ہیں
تا ابد آتے رہیں گے

ابوطالب کے بیٹے حفظِ ناموسِ رسالت کی روایت کے امیں تھے
جان دینا جانتے تھے
وہ مسلم ہوں کہ وہ عباس ہوں عون و محمد ہوں علیٰ اکبر ہوں قاسم ہوں علیٰ اصغر ہوں
حق پہچانتے تھے
لشکرِ باطل کو کب گردانے تھے

ابوطالب کے بیٹے سر بریدہ ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں
ابوطالب کے بیٹے پا بجولاں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں

ابو طالب کے بیٹے سے فرزند اس ہو کے بھی اماں حق کرتے رہے ہیں
مدینہ ہونگا ہو کر بارہ نسلیں و سامرو ہو مشہد و بغداد ہو
آل ابو طالب کے قدموں کے نشان
انسانیت واس مدنیل کا پڑتا ہے ترہے ہیں تا ابد یہ ترہے ہیں کے
ابو طالب کے بیٹوں اور نواسوں میں ابھن اپنی طالب میں اک نسبت رہی ہے
محبت ان یہ سب نہ بہر قائم رہے انی
تا ابد قائم رہے انی

ابوذر غفاریؓ کے لیے ایک نظم

سلام ان پر درود ان پر
وہ کہہ رہے تھے
”زمیں نے بوجھا لیے آدمی کا نہیں اٹھایا جوتم سے سچا ہواے ابوذر“
وہ کہہ رہے تھے
”فلک نے سایہ نہیں کیا لیے آدمی پر جوتم سے سچا ہواے ابوذر“
سچی یہاں روکیں تصدیق کر رہے تھے
تمام اہل یقین تصدیق کر رہے تھے
سلام ان پر درود ان پر
مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا
وہی مدینہ ہے اور ابوذر ہیں اور منبر کا فیصلہ ہے
اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے وہ قول صادق سے مختلف ہے
جو قول صادق سے مختلف ہے وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان
اک سوال بن کر ٹھہر گیا ہے

بہت زمانہ کرنے کیا ہے تیرا بود رانکا دیں یہیں
پاس یہیں ۵۰ تجہ زور آور واسیں
سارش سے سارے ملکہ نہیں یہیں
بُشق و بُخدا و قلیلہ سارے سال مصائب میں بخشش پہ پڑے، اے تمام ہنہ
نہیں یہیں
جن ملکہ ملکوں اب، یہ رہ ملکوں بے
بیمار ہے تے اب وہ رہ ملکوں بے

اسامة بن زید کے نام ایک نظم

پرچم جیشِ اسامة مرا اعزاز کہ میں
تیرے ناموس کو کرتا ہوں سلام

اک طرف سارے نجیب ابن نجیب ابن نجیب
اک طرف ایک غلام ابن غلام ابن غلام

حرمتِ حرفاً رسول ایک طرف
جادۂ نخوت پارینہ کی اڑتی ہوئی دھول ایک طرف

اب بھی نخوت ہے وہی جبہ و دستار کے پیچ
وہی معیارِ شرف درہم و دینار کے پیچ

اک غلام ابن غلام ابن غلام ابن غلام
اب بھی نرغے میں ہے اک شہرِ دلآلزار کے پیچ

نرغہ اہلِ تکبر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیق پڑھ نہیں ہے کہ بچا لے مجھ کو

آئینہِ انہا حسن ہیں
کیا جانے زمانہ کیا حسن ہیں

اک صبر ہے فاطمہ کی میراث
اس صبر کا معجزہ حسن ہیں

اک سمت علیؑ، حسینؑ اک سمت
اک تجت قائمہ، حسنؑ ہیں

اک بدر حسینؑ میں مجسم
اک صلح حدیبیہ حسنؑ ہیں

زینت ہیں تتمہ شہادت
دیباچہ کربلا حسنؑ ہیں

نہ معجزہ ہے کر بلا نہ حادثہ ہے کر بلا
جو خون سے لکھا گیا وہ فیصلہ ہے کر بلا

یہی نہیں کہ صرف اپنے عہد میں ہو آج بھی
جهانِ مصلحت میں حرفِ بر ملا ہے کر بلا

ہر ایک جبر کے خلاف خیر کے محااذ پر
جو مستقل پا رہے وہ معمر کہ ہے کر بلا

مدینہ و نجف کی خاکِ پاک اور اس کے بعد
حسینؑ مرکزِ وفا ہیں دائرہ ہے کر بلا

سان و خنجر و کمان ، مشک و چادر و علم
نشانیوں کا اک عجیب سلسہ ہے کر بلا

صدائے استغاثہ

ھل مِن نَاصِرًا يَنْصُرُنَا
ھل مِن نَاصِرًا يَنْصُرُنَا
کیا کوئی ہے جو میری مدد کو پہنچے گا
کیا کوئی ہے جو میری مدد کو پہنچے گا

صدیوں پہلے دشتِ بلا میں ایک آواز سنائی دی تھی
جب میں بہت چھوٹا ہوتا تھا مجھ سے مری امی کہتی تھیں
یہ جو صرفِ عز اپنچھتی ہے اسی صدائی بازگشت ہے
اسی صد اپر بستی گریہ وزاری کا سامان کیا جاتا ہے
اور تجدید بیعت نصرت کا اعلان کیا جاتا ہے
تب میں پھر وہ بیٹھ کے پیارے پیارے اچھے اچھے لوگوں کی باتیں سُستا تھا
پچھے لوگوں کی باتیں پڑھتا تھا اور پھر وہ رو تارہ تھا
اور اب برسوں بیت گئے ہیں

جن آنکھوں میں آنسو تھے اب ان آنکھوں میں حیرت ہے
سچائی کی گواہی دینے والے آخر نظام کو ظالم کہنے سے ڈرتے کیوں ہیں موت سے پہلے
مرتے کیوں ہیں

شامِ غریبائی

دشتِ بلا میں لہوڑ لاتا دن گزرے گا شام آئے گی
 شام آئے گی فاتحِ خیبر کے بیٹوں کی لاشوں پر گھوڑے دوڑیں گے
 شام آئے گی آلِ فاطمہ کے خیموں میں آگ لگے گی
 شام آئے گی نیزوں پر قرآن اٹھانے والے اب کے صابرآلِ محمد کا سر قلم کریں گے
 علم کریں گے

دشتِ بلا میں لہوڑ لاتا دن گزرے گا شام آئے گی
 شام آئے گی سیدہ عالم کی بیٹی جلے ہوئے خیموں کے درمیاں سجدہ شکر بجالائے گی
 مالک! سجدہ شکر کہ میرا ماں جایا پیکاں سہ شعبہ کھائے ہوئے بچے کے بعد بھی
 مقتل میں سرشار رہا
 سردینے پر تیار رہا
 ایفاۓ عہد کی منزل میں بیدار رہا
 مالک! سجدہ شکر کہ وہ کرّ ارتھا اور کرّ ار رہا
 دشتِ بلا میں لہوڑ لاتا دن گزرے گا شام آئے گی

عبدِ امانت سرنوشت میں شامل تھا
بیعت سے انکار سرنوشت میں شامل تھا

آگ لیے جاتی تھی خر کو اپنی طرف
ایک قدم اور اہل بہشت میں شامل تھا

وہ تو یہ کہیے میرے اشک مرے کام آئے
ورنہ میں بھی سنگ و خشت میں شامل تھا

نہ مال و زر ہے نہ جاہ و حشم ہمارا ہے
مگر خدا کی عطا ہے قلم ہمارا ہے

علم کسی نے کسی کو دیا تھا خیبر میں
وہ دن اور آج کا دن اب علم ہمارا ہے

قرآن حق ہے اور نبیٰ حق کے ساتھ ہے
جو ہے نبیٰ کے ساتھ وہی حق کے ساتھ ہے

فرمانِ پاک سیدِ والا یہ ہے کہ بس
جو ہے علیٰ کے ساتھ وہی حق کے ساتھ ہے

سند پر مہر ختمی مرتبہ اے دل مبارک
غلامی علیٰ مرتضیٰ کامل مبارک

مبارک باد دینے آئے ہیں سلمان و بوذر
قدم بوئی کوائٹھ، ہم مشربوں سے مل، مبارک

یہ میرے لفظ جو کچھ آب و تاب رکھتے ہیں
کسی سے منزلت انساب رکھتے ہیں

کتاب و سیرت و آل نبی سے ہیں مربوط
جو دل میں حبِ علیٰ بے حساب رکھتے ہیں

وہ ہم ہی ہیں کہ در شہرِ علم کے ہوتے
کوئی بھی در ہو بہت اجتناب رکھتے ہیں

وہ اور ہوں گے جو مشکلِ گشا کے ہوتے ہوئے
دلوں میں کشمکش و اضطراب رکھتے ہیں

زمانے بھر کی فتوحات، علیٰ کی اک ضربت
وہ اپنی جانیں ہم اپنا حساب رکھتے ہیں

کتابِ نور کبھی ان پر گھل نہیں سکتی
جو بغضِ آلِ رسالت مآب رکھتے ہیں

کسی بھی طرح کی محفل ہو ، کوئی مجلس ہو
مرے امام مجھے کامیاب رکھتے ہیں

ندیم دوست سے آتی ہو نوئے دوست جنہیں
وہ حق بندگی بوتراب رکھتے ہیں

العلم حجابُ الأَكْبَر

کبھی کبھی خود چراغ کی لو یہ چاہتی ہے
کہ ایک سرکش ہوا کا جھونکا ادھر بھی آئے
جورات آنکھوں میں چھپ رہی ہے نظر بھی آئے
پھر اس اندر یہرے میں ہر مسافر کو جادہ خیر کے سبھی دیں پناہ یاد آئیں
اپنے مہرا پنے ماہ یاد آئیں
وہ یاد آئیں کہ جن کے انوارِ قدس کی بارشوں میں کوئین اپنا گرد و غبار دھولیں
وہ یاد آئیں کہ جن کے ناموں کے اسمِ اعظم کی روشنی ہو تو سنگ بو لیں
حجابِ اکبر اٹھے تو سر وجود کھولیں

وارثِ احمدِ مختار ہے آنے والا
نائبِ حیدر کراز ہے آنے والا

جنس بازارِ معاصی ہیں مگر جانتے ہیں
اک ہمارا بھی خریدار ہے آنے والا

مرے خدا مرے لفظ و بیان میں ظاہر ہو
اسی شکستہ و بستہ زبان میں ظاہر ہو

زمانہ دیکھے مرے حرف باریاب کے رنگ
گل مراد ہنر کشت جاں میں ظاہر ہو

پس حجاب ہے اک شہسوارِ وادیٰ نور
کے خبر اسی عبدِ زیان میں ظاہر ہو

مالک نے جو چاہا تو اجازت نہیں ہو گئی
تو فیض قدم بڑی حضرت نہیں ہو گئی
طیبہ کا نہ یوں تو کنی بار ہوا ہے
دل کرتا ہے اس بار زیارت نہیں ہو گئی

مالک درد کو محکم رکھنا ایک ہی غم کے ساتھ
جیسے مشکل بھم رہتی ہے ایک علم کے ساتھ

بَابِ بازگشت

اب اس میں کاوش کوئی نہ کچھ اہتمام میرا
ہوا میں محفوظ کر رہی ہیں کلام میرا

میں کچھ کریموں کے باب نعمت سے منسلک ہوں
سو خود بخود ہو رہا ہے سب انتظام میرا

تو کیا یہی اک گمان ہے ہر تھن کی بُنیاد
کہ حد تارِ نفس سے آگے ہو نام میرا

میں سرکشی سے سپردگی کی طرف چلا ہوں
خدا جو چاہے تو یہ بھی بن جائے کام میرا

چلا تو ہوں ایک منزلِ خوش خبر کی جانب
عجب نہیں یہ سفر بھی ہو ناتمام میرا

دلوں کو تاراج کرنے آیا تھا تمکنت سے
پلٹ گیا مجھ کو دیکھ کر خوش خرام میرا

جو لالہ و گل کو خار و خس سے جُدانہ کر پائے
ہر ایسے موسم کو ڈور ہی سے سلام میرا

یہ قتل نامے چہ دستخط تو مرے نہیں ہیں
کہر یہ خلق خدا جو لیتی ہے نام میرا
یہ میرے دشمن یونہیں تو پسپا نہیں ہوئے ہیں
وہ تو بے لے رہا ہے جو انتقام میرا

ہم ابلِ جبر کے نام و نسب سے واقف ہیں
سرروں کی فصل جب اُتری تھی تب سے واقف ہیں
کبھی چھپے ہوئے خنجر، کبھی کھنچی ہوئی تیغ
سپاہِ ظلم کے ایک ایک ڈھب سے واقف ہیں
وہ جن کی دستخطیں محضرِ ستم پہ ہیں ثبت
ہر اُس ادیب، ہر اُس بے ادب سے واقف ہیں
یہ رات یوں ہی تو دُشمن نہیں ہماری کہ ہم
درازیٰ شبِ غم کے سبب سے واقف ہیں
نظر میں رکھتے ہیں عصرِ بلندِ بامسیٰ مہر
فراتِ جبر کے ہر تشنہِ لب سے واقف ہیں
کوئی نئی تو نہیں حرفِ حق کی تنہائی
جو جانتے ہیں وہ اس امرِ رب سے واقف ہیں

کسی اہل ہجر کی بد دعا ہے کہ خود سری کا قصور ہے
یہ جو بات بن کے بگڑ رہی ہے تو کوئی بات ضرور ہے

وہ عجیب رات تھی سارے شہر میں اک چراغ نہیں جلا
مگر اک لکیر لہو کی ایسی کھنچی کہ نور ہی نور ہے

یہ عجیب لوگ ہیں جن کے نقچ پکھر رہی ہے متاعِ عمر
نہ کسی پہ گردِ جنون ہے نہ کہیں غبارِ شعور ہے

مری بے گھری مجھے کیسے کیسے دروں گھروں پہ لیے پھری
مرا واہمہ تھا کہ مپرے رخت سفر میں جوہر نور ہے

میں چراغ لے کے ہوا کی زد پہ جو آگیا ہوں تو غم نہ کر
میں یہ جانتا ہوں کہ میزے ہاتھ پہ ایک ہاتھ ضرور ہے

اعلان نامہ

میں لاکھ بُزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں کہ جس کے بیٹوں نے
جو کہا اُس پہ جان دے دی
میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمه گا ہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے
میں جانتا تھا مرافقبیلہ بُریدہ اور بے ردا سروں کی گواہیاں
لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا
سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا
اور اب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو نذرِ سر لے کے آگیا ہوں
تب اہ ہونے کو ایک گھر لے کے آگیا ہوں
میں لاکھ بُزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں

ایک رُخ

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خجرا ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد ایک ستانہ چھا جاتا ہے
یہ ستانہ طبل و علم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
ستانہ فریاد کی لئے ہے احتجاج کا لبجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

ان وَعْدَ اللّٰهُ حَقٌّ

چے لوگ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں
سب تعریفیں اس کے لیے ہیں جو فتاویٰ عظام ہے
اور جو کشفِ ارادہ ہے
مرے حضور سے مرے خُدا کا وعدہ ہے
خیر کے گھر میں جتنے دروازے کھلتے ہیں
اُن میں اک تو بہ کا بھی دروازہ ہے
اشکِ ندامت اپنی جگہ پر آپ بڑا
خمیازہ ہے
مرے حضور سے مرے خُدا کا وعدہ ہے

هَلْ مِنْ نَاصِرٌ أَيْنَ نُصْرَنَا

یہ زمینوں آسمانوں کے عذاب اور میں اکیلا آدمی
میں اکیلا آدمی کب تک لڑوں
سارے دشمن در پئے آزار، لشکر صف پھصف
لشکروں کے سب کمانداروں کے رخ میری طرف
اور میں نہتا آدمی
میں نہتا آدمی کب تک لڑوں
میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں

انی گُنٹ من الظالِمین

پڑھاتو یہ تھا زمینِ عنبر پہ کشت خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے
سُنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعتِ خاک کرنے والے نہیں رہیں گے
مگر ہو ایوں کہ نیزہ شام پر سر آفتاًب آیا
امانتِ نور جس کے ہاتھوں میں تھی اُسی پر عذاب آیا
اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں
ہماری قبریں کہاں بنیں گی؟
خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا کی ویرانیاں بتائیں
جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا ہون دیکھیں اب ایسی ماں میں کہاں سے لا میں

فارسی طغرا

اگر دانی کہ عالی خاندانم
نظر بر خاندانِ مصطفیٰ کُن
اگر گوئی کہ گشتم در بلائے
نظر بر کشتگانِ کربلا کُن
بہ دُنیا اگر کسے پایندہ بُودھے
ابوالقاسم محمد زندہ بُودھے

آزاد ترجمہ:

اگر کچھ زعم ہے نام و نسب پر
علوئے خاندانِ مصطفیٰ دیکھے
اگر رنج و مصیبت سے ہے دل چور
تو سوئے کشتگانِ کربلا دیکھے
اگر ارض و سما پایندہ ہوتے
ابوالقاسم محمد زندہ ہوتے

ایک سوال

میرے آبادا جداد نے حُرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمہ حق کہا

مقتلوں، قید خانوں، صلیپوں میں بہتال ہوان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا

اور میں پا برہنہ سرِ کوچہ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی

سو چتارہ گیا

جسم میں میرے اُن کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

منظر سے ہیں نہ دیدہ بینا کے دم سے ہیں
سب معجزے طسمِ تماشا کے دم سے ہیں

مٹی تو سامنے کا حوالہ ہے اور بس
گوزے میں جتنے رنگ ہیں دریا کے دم سے ہیں

کیا ایسی منزلوں کے لیے نقدِ جاں گنوائیں
جو خود ہمارے نقشِ کف پا کے دم سے ہیں

یہ ساری جنتیں یہ جہنم ، عذاب و اجر
ساری قیامتیں اسی دُنیا کے دم سے ہیں

ہم سارے یادگارِ زمین و زمانہ لوگ
اک صاحبِ زمین و زمانہ کے دم سے ہیں

میرا مالک جب توفیق ارزانی کرتا ہے
گھرے زرد زمیں کی رنگت دھانی کرتا ہے

بجھتے ہوئے دیے کی لو اور بھیگی آنکھ کے پیچ
کوئی تو ہے جو خوابوں کی نگرانی کرتا ہے

مالک سے اور منٹی سے اور ماں سے بااغی شخص
درد کے ہر بیثاق سے روگردانی کرتا ہے

یادوں سے اور خوابوں سے اور أمیدوں سے ربط
ہو جائے تو جینے میں آسانی کرتا ہے

کیا جانے کب کس ساعت میں طبع رواں ہو جائے
یہ دریا بے موسم بھی طغیانی کرتا ہے

سیلِ جنوں ساحل کی جانب آتا ہے
خواب شب تاریک پہ غالب آتا ہے

ذرّہ ہوں منسوب ہوا ہوں مہر کے ساتھ
روشن رہنا مجھ پر واجب آتا ہے

دل کی تباہی کے چھوٹے سے قصے میں
ذکرِ ہزار اطراف و جوانب آتا ہے

مٹی پانی آگ ہوا سب اُس کے رفیق
جس کو اصولِ فرقِ مراتب آتا ہے

دل روئے اور گریے کی توفیق نہ ہو
ایسا وقت بھی عارف صاحب آتا ہے

مالک! یہ آب و خرمایہ نان و نمک نہ دے
تیری رضا نہ ہو تو مجھے خاک تک نہ دے

بس ایک خواب جس کی حدیں دسترس میں ہوں
وہ بھی نہ دے، پہ خواب فلک درفلک نہ دے

میں کیا کروں گا جان کے اسرارِ کائنات
مجھ کم نظر کو سرِ سما و سمک نہ دے

کچھ نام جانتا ہوں وہ کافی ہیں اور بس
یہ ساتھ ہیں تو کچھ ابد آباد تک نہ دے

و رو زباں رہیں انہیں نورائیوں کے نام
جب تک یہ خاک چادرِ امکان ڈھک نہ دے

غبارِ دشتِ طلب زیادہ ہے تو جنوں میں زیادہ ہو جا
مہارِ ناقہ کو پشتِ ناقہ پہ ڈال دے پا پیادہ ہو جا

بس ایک ہی راستہ ہے دُنیا کو زیر کرنے کا، جتنے کا
یہ جتنی پُر پیچ ہوتی جائے اُسی قدر سہل و سادہ ہو جا

یہ میرا ذمہ کہ خود تری منزليں تعاقب کریں گی تیرا
بس ایک محمل کو دیکھو اور بے نیاز ہر رخت و چادہ ہو جا

وہ جس کے ادنیٰ سے اک اشارے پہ مہرو مہتاب جاگتے ہیں
اسی کے قدموں پہ اپنی مرضی کو ڈال دے، بے ارادہ ہو جا

اور اس سے پہلے کہ چشمِ بینا سے تابِ نظارہ چھین لی جائے
قریب کے منظروں میں زنجیرِ ذہن، کچھ تو کشادہ ہو جا

خوں بہا

اپنے شہسواروں کو
قتل کرنے والوں سے
خوں بہا طلب کرنا
وارثوں پہ واجب تھا
قاتلوں پہ واجب تھا
خوں بہا ادا کرنا
واجبات کی مکمل
منصفوں پہ واجب تھی
(منصفوں کی نگرانی
قدسمیوں پہ واجب تھی)
وقت کی عدالت میں
ایک سمت مند تھی
ایک سمت خنجر تھا
تاج زر زگار اک سمت

ایک سمت لشکر تھا
اک طرف تھی مجبوری
اک طرف مقدار تھا
ٹالئے پکارا ٹھے
”تاج و تخت زندہ باد!
ساز و رخت زندہ باد!“
خلق ہم سے کہتی ہے، سارا ماجرا لکھیں
کس نے کس طرح پایا اپنا خوب بہا لکھیں
چشم نم سے شرمندہ،
ہم قلم سے شرمندہ، سوچتے ہیں کیا لکھیں

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیز سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صحح سوریے رن پڑنا ہے اور گھسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اٹا شہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

دریا پر قبضہ تھا جس کا اُس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

کاسہ شام میں سورج کا سر اور آوازِ اذال
اور آوازِ اذال کہتی ہے فرض نبھانا ہے

سب کہتے ہیں اور کوئی دن یہ ہنگامہ دہر
دل کہتا ہے ایک مسافر اور بھی آنا ہے

ایک جزیرہ اس کے آگے پچھے سات سمندر
سات سمندر پار سُنا ہے ایک خزانہ ہے

پس گردِ جادہ درد نور کا قافلہ بھی تو دیکھتے
جو دلوں سے ہو کے گزر رہا ہے وہ راستہ بھی تو دیکھتے
یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی
بھی راویان خبر زده پس واقعہ بھی تو دیکھتے
یہ گلو گرفتہ و بستہ رسن جفا ، مرے ہم قلم!
بھی جابریوں کے دلوں میں خوفِ مکالمہ بھی تو دیکھتے
یہ جو پتھروں میں چھپی ہوئی ہے شبیہ ، یہ بھی کمال ہے
وہ جو آئینے میں ہمک رہا ہے وہ محجزہ بھی تو دیکھتے
جو ہوا کے رُخ پر گھلے ہوئے ہیں وہ بادبائی تو نظر میں ہیں
وہ جو موجِ خون سے اُلچھ رہا ہے وہ حوصلہ بھی تو دیکھتے
یہ جو آبِ زر سے رقم ہوئی ہے یہ داستان بھی مستند
وہ جو خونِ دل سے لکھا گیا ہے وہ حاشیہ بھی تو دیکھتے
میں تو خاک تھا کسی چشمِ ناز میں آ گیا ہوں تو مہر ہوں
مرے مہرباں بھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھتے

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جبانِ رزق میں توقیرِ ابلِ حاجت کیا

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سُکِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

دمشقِ مصلحت و کوفہ نفاق کے پیچ
بغدادِ قافلہ بے نوا کی قیمت کیا

مالِ عزتِ ساداتِ عشق دیکھ کے ہم
بدل گئے تو بدلنے پہ اتنی حیرت کیا

فروغِ صنعتِ قد آوری کا موسم ہے
سُکِ ہوئے پہ بھی نکلا ہے قد و قامت کیا

اب بھی تو میں اطاعت نہیں ہو گی ہم سے
دل نہیں ہو گا تو بیعت نہیں ہو گی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشپیب کے ساتھ
رزق برق ہے یہ خدمت نہیں ہو گی ہم سے
دل کے معبد جینوں کے خداوں سے الگ
ایسے عالم میں عبادت نہیں ہو گی ہم سے
ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحب ! اب کوئی بحرت نہیں ہو گی ہم سے
أجرتِ عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
کچھ بھی کر لیں گے یہ خدمت نہیں ہو گی ہم سے
خن آرائی کی صورت تو نکل سکتی ہے
پر یہ چکنی کی مشقت نہیں ہو گی ہم سے

ملے تو کیسے ملے منزلِ خزینہِ خواب
کہاں دمشق مقدر کہاں مدینہِ خواب

سیاہ خانہِ خوف و ہراس میں اک شخص
سنارہا ہے مسلسل حدیثِ زینہِ خواب

یقین کا ورد و وظیفہ نہ اسمِ اعظمِ عشق
تو پھر یہ کیسے کھلے گا طسمِ سینہِ خواب

جباں جباں کی بھی مٹی بھیں پسند آئی
و باں و باں پہ امانت کیا دفینہِ خواب

خروشِ گریہ بے اختیار ایسا تھا
ترنخ کے ٹوٹ گیارات آگیتہِ خواب

شکستِ خواب گزشتہ پہ نوحہ خوانی ہوئی
پھر اس کے بعد بھی محفلِ شہینہِ خواب

میسر آئی ہے توفیقِ شعر خوش ہو لیں
نہ پھر یہ سیلِ رواں ہے نہ یہ سفینہِ خواب
انپس و آتش و اقبال سے مسلسل ہے
یہ سادہ کاری ، یہ صناعی گلکینہِ خواب

گلی کوچوں میں ہنگامہ بپا کرنا پڑے گا
جودل میں ہے اب اُس کا تذکرہ کرنا پڑے گا

نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو
مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا

وہ کیا منزل جہاں سے راستے آگے نکل جائیں
سواب پھر اک سفر کا سلسہ کرنا پڑے گا

لہو دینے لگی ہے پشم خون بستہ سو اس بار
بھری آنکھوں سے خوابوں کو رہا کرنا پڑے گا

مبادا قصہ اہل جنوں نا گفتہ رہ جائے
نئے مضمون کا لہجہ نیا کرنا پڑے گا

درختوں پر شرارے سے پہلے آئے تھے پھول
پھلوں کے بعد کیا ہو گا پتہ کرنا پڑے گا

گنو بیٹھے تری خاطر ہم اپنے مہرو مہتاب
بتا اب اے زمانے اور کیا کرنا پڑے گا

شہر گل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
جس کا وارث ہوں اسی خاک سے خوف آتا ہے

رحمت سید لاک پہ کامل ایمان
امت سید لاک سے خوف آتا ہے

یہ معجزہ بھی کسی کی دعا کا لگتا ہے
یہ شہر اب بھی کسی بے وفا کا لگتا ہے

یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

دل اس کے ساتھ مگر تیغ اور شخص کے ساتھ
یہ سلسلہ بھی بہت ابتدا کا لگتا ہے

نہود نور ہے اور غیب سے شہود میں ہے
مری دعا کی جزا خود مرے درود میں ہے

کتاب و حکمت و خیر کثیر و ملک عظیم
بڑی جزا ہے مگر ایک بھی وجود میں ہے

آخری آدمی کا رجز

مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
فغانِ خلق اہل طائفہ کی نذر ہو گئی
متاعِ صبر و حشتِ دعا کی نذر ہو گئی
امیدا جر بے یقینی جزا کی نذر ہو گئی
نہ اعتبارِ حرف ہے نہ آبروئے خون ہے
سکون ہی سکون ہے
مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
خلیجِ اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولت غنیم بانٹ دی گئی

طنابِ خیمه لسان ولقط کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون، ہی سکون ہے
مصطفیٰ حبین شاہ مطہری ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے
سکون، ہی سکون ہے

دولتِ نغمہ و آہنگ و فغاں میری ہو
یہی دُنیا یہی غارت گر جاں میری ہو

سینہ ظلم میں ہونا ہے ترازو اک تیر
کاش ایسا ہو کہ اس بار کماں میری ہو

خلعت و مند و دستار ملے جس کو ملے
خاکِ پاکِ در صاحبِ نظر اس میری ہو

تھک کے جب بیٹھ رہے قافلہِ دل زدگاں
گرد فرداۓ جہاں گزر اس میری ہو

مالکِ الملک جو چاہے تو یہ عزت مجھے دے
ایک دنِ حملکتِ لفظ و بیان میری ہو

میں چاہتا تھا کہ سورج مری گواہی دے
سو میں نے رات کے آگے سپر نہیں ڈالی

بَابٌ تَصْدِيقٌ

پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالحیر کشفعی

افتخار عارف کی نعت

افتخار عارف نے اپنے حافظے اور علم و معلومات کے ذریعے اپنا تعارف کرایا اور پھر غزل کے اس دور میں اُس کی غزل گوئی نے سماں توں میں اپنی جگہ بنائی۔ اس کے اس شعر کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

اس کی یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں جس طرح قبول ہوئی اس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ وہ کسی مکان، کسی نگرا اور کسی دیار میں رہے، اللہ پاک نے مدینہ منورہ کو اس کی حقیقی شخصیت کا گھر بنادیا ہے اور جب اس کے رب نے اسے یہ دولت عطا کر دی تو اسے خبر ہوئی اور بے اختیار دل سے آواز ابھری:

عمر بھر ٹھوکریں کھاتانہ پھر دل شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی در پر کھا

اور اس شہر میں اسے مدحت شافع محضر ﷺ پر مقرر کیا گیا، آدمی کو چاکری ملے تو ایسی کہ شہنشاہ بھی رشک کریں۔

شعر کے بارے میں کئی نظریات، تصورات اور خیالات ہیں۔ مجھے ان میں تضاد نظر نہیں آتا بلکہ یہ ایک

دوسرا کا تکملہ معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری کی ایک ادا بے ساختہ پن ہے اور ایک شیوه آرائی ہے۔ شاعری میں سادگی بھی ہے اور مرصع ساز کا کام بھی۔ افتخار عارف کی شاعری اور بالخصوص نعت میں سارے رنگ موجود ہیں۔ بھریں ایسیں کہ ان میں نغمے لفظ بے لفظ آگے بڑھتی ہے اور مرصع ختم کرنے کے بعد اس کی اہریں ذہن میں پھیلتی جاتی ہیں۔ لفظ ایسے جیسے عقیدت اور محبت تمام محمدی ﷺ کے باب میں سوچ رہے ہوں۔ فکر اور جذبہ کا ایسا امتران آن کے میں نعت گوشاغروں کے باہم نظر آئے گا۔

افتخار عارف کی ان نعمتوں میں سرکار ختمی مرتبت ﷺ کی ازالہ تا ازل تا ابد وقت پر حاوی شخصیت اور رہالت کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ابل بیت اور میان ابل بیت کی محبت کی شادابی بھی ہے۔ بعض لوگ جو کئی مذہبی و کھانی دیتے ہیں، اندر سے دنیادار نکلتے ہیں اور بعض انظر بظاہر دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگ حقیقی مذہبیت سے مالا مال ہوتے ہیں کہ ایسی مذہبیت حب رسول ﷺ سے عبارت ہوتی ہے۔

افتخار عارف کی نعمتوں کے مطابع سے میری بات آپ پرواہنخ ہو سکے گی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

ساختہ کر بل اب طور شعری استعارہ..... ایک اقتباس

اب ہم اس شاعر کا ذکر کریں گے جس کے یہاں یہ رجحان ایسی محیت اور تخلیقی شان سے اظہار پذیر ہوا ہے کہ اس کے شعری شناخت نامے کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے، ہماری مراوا افتخار عارف سے ہے۔ افتخار عارف کے بارے میں میں اپنے مضمون میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ واقعہ کر بل اور اس کے تعلیقات کا نئے سماجی انسانی مفہومیں استعمال یوں تو اور وہ کسی ملتا ہے لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے، اس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ افتخار عارف کے یہاں یہ بات ان کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ مجھے موجود کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورت حال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسے مرکزی کردار کا تصور ملتا ہے، جو مسلسل بھرت میں ہے، عذابوں میں گھرا ہوا ہے، در بدر خاک برمارا پھر رہا ہے، اور کوئی دارالامال اور جائے پناہ نہیں۔ ان کے یہاں بنیادی تاریخی حوالے سے جو پیکر ابھرتے ہیں، مثلاً پیاس، دشت، گھرانا، گھسان کارن، بستی، بیباں، قافلہ بے سرو ساماں، یہ سب ثقافتی روایت کے تاریخی نشانات بھی ہیں اور آج کے عذابوں میں گھری ہوئی زندگی کے کوائف و ظواہر بھی۔ ان کا شعری وجدان کچھ اس نوع کا ہے کہ ان کے اشعار صد یوں کے درد کا منظر نامہ بن جاتے ہیں اور ان میں وہ لطف و تاثیر بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے خُداد کہا گیا ہے:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صحح سوریے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اٹا شہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اُس کی پیاس عذاب
جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے

.....

بستی بھی سمندر بھی بیباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری خواب پریشان بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیاس بھی مرا ہے
جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سمجھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی مرا ہے
جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل
وہ قافلہ بے سروسامان بھی مرا ہے
ویرانہ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چنخ پڑا میں کہ یہ عنوان بھی مرا ہے

دار فتنگیں صحیح بشارت کو خبر کیا
اندیشہ صد شام غریبیاں بھی مرا ہے
مئی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی!
یوں ہوتا یہ زنجیر، یہ زندگی بھی مرا ہے
.....

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوجہ سناء پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
شاخ بریدہ کھلی فضا سے پوچھ رہی ہے
کوئی شکستہ پر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
خاک اڑانے والے لوگوں کی بستی میں!
کوئی صورت گرنہیں دیکھا بہت دنوں سے
سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہ
بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ افتخار عارف کے یہاں بنیادی تاریخی حوالے سے فیضان حاصل کرنے اور اس سے گوناگوں شعری کیفیات ابھارنے کا ان کا شعری پیرا یہ شدید انفرادیت رکھتا ہے۔ پیاس، دشت، گھرانا، رن پڑنا، ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ، ڈھالیں، شام، مسافر، چاک گریباں، قافلہ بے سروساماں، شام غریباں، قاتل، خنجر، خیمه، لشکر، نوجہ سناء، سپاہ شام، نیزے پہ آفتاب کا سر، یہ سب

سامنے کے تعلق کے ہیں لیکن ان کی حیثیت محض الفاظ کی نہیں، یہ وقت کی محض ایک سطح پر کسی ایک حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ افتخار عارف کا شعری وجد ان موجود صورتِ حال کی سفا کی کے بیان میں ان سے نئی نئی معنویاتی جہات پیدا کرتا ہے۔ غور فرمائیے کہ وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے، میں جہاں ضمیر ”وہی“ کی تکرار اور ”ہے“ حالیہ صیغہ نے جور دیف کا حصہ ہے، ان اشعار کو مجھے موجود سے جوڑ دیا ہے، وہاں پیاس، دشت، گھرانا، مشکیزہ، وغیرہ علام اس سانچے عظیم کی یاد تازہ کرتے ہیں جس نے حق و صداقت کے تحفظ کی خاطر خون کی گواہی سے انسانیت کو صدیوں سے یہ راب رکھا ہے۔ دوسری غزل بھی بے پناہ ہے۔ بستی بھی سمندر بھی بیاباں بھی مرا ہے ریا رجود وہی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری ریا رجو ٹوٹا جاتا ہے وہ پیاں بھی مرا ہے، میں کس کی آواز ہے۔ یا رجو ہاتھ اٹھے تھے وہ بھی ہاتھ تھے میرے یہ کس کے ہاتھ تھے، یہ کون کہہ رہا ہے کہ جس کی کوئی آواز نہ پہچان نہ منزل، وہ قافلہ بے سرو سامان بھی مرا ہے۔ یہاں مرا اور میرے کی ضمیر سے درد کی مقدس روایت سے ایک ازلی وابدی رشتہ قائم ہو گیا ہے، اور یہ احساس پورے شعری وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ درد افتخار عارف کے لبھ کی خاص پہچان ہے۔ تیسرا غزل، خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے، میں ردیف ”بہت دنوں سے“ واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے کہ ظلم و تعدی کے خلاف حق کوشی کی جدوجہد حیاتِ انسانی کا وظیفہ ہے جس کی انسان کو آج شدید ضرورت ہے۔ اس غزل میں بھی رنک سنان پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے، کے علاوہ کہیں کوئی واضح تاریخی پیکر نہیں، لیکن پوری غزل درد کے احساس میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ کمال تاریخی تعلیقات کے استغفاری و علامتی استعمال کا ہے۔ یہ استعمال جیسا کہ ہم دیکھے چکے ہیں، دوسروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن غزل میں جس بڑے پیانے پر اس کی کارفرمائی افتخار عارف کے احساس ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ استغفاری اظہار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اسے تخلیقی رچاؤ اور گھرے احساس سے بر تاجائے تو اس کے امکانات لا محدود ہو جاتے ہیں۔ اس کے گوناگون مفہوم کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ معلوم ہے کہ

استعارہ قطعیت کی ضد ہے۔ اس کا نقطہ آغاز ٹھوں حقیقت ہی ہے، لیکن تھی شعری کارفرمائی کے بعد معنیاتی امکانات کی اتنی جہات پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کا قطعی بیان ممکن نہیں۔ اس نوع کے معنیاتی امکانات کا وضاحت کی گرفت میں نہ لاسکن معنیات کا قدیمی مسئلہ ہے اور اتنی غیر قطعیت میں شعری اظہار کے کیف و اثر یعنی سُن کاری کا راز پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے۔ استعاراتی اظہار کے کیف و اثر یعنی سُن کاری کا راز پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے۔ استعاراتی اظہار کے کیف و اثر یعنی سُن کاری کا راز پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے۔ اس کے روشن اور ذہن دلے خطے، تو ان سے کہ فیض کرنا اور لطف اندوں ہونا قاری کے ذوق و ظرف پر منحصر ہے (نقاد کی حیثیت بھی باخبر، باذوق، تربیت یافتہ قاری کی بھوتی ہے) یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ قطعی تاریخی معلومات اور تخلیقی سطح پر کارفرما ہونے والے تاریخی احساس میں نازک سافرق ہے۔ قطعی تاریخی معلومات شعور کا حصہ ہیں، لیکن جب یہ شعری احساس میں داخلی ہیں تو ذہن و شعور کی تمام سطحیں یعنی تحت اشعور اور لاشعور بھی کارفرما ہوتے ہیں اور یہ پوری سائیکی اور پورے تخلیقی وجود کا حصہ ہن جاتی ہیں۔ چنانچہ کھرے شعری احساس میں ان کا دائرة عمل اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ تمام کیفیتوں کا تعین ممکن نہیں رہتا:

کہیں سے حرف معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے
کے معلوم ابل بھر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے
.....

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا
.....

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذاب در بدری کس کے گھر میں رکھا جائے
.....

وفا کے باب میں کارِ خن تمام ہوا
مری زمین پر اک معزکہ لبو کا بھی ہو

.....

یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا
میں جس میں رہ رہا تھا وہی گھر مرا نہ تھا
میں جس کو ایک عمر سنبھالے پھر ا کیا
مشی بتا رہی ہے وہ پیکر مرا نہ تھا
موج ہوائے شہر مقدر جواب دے
دریا مرے نہ تھے کہ سمندر مرا نہ تھا
سب لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ تھے
اک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

افتخار عارف کے یہاں، شہر کے پیکر کو بھی مرکزیت حاصل ہے۔ یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے... تمام شہر
مکرم، بس ایک مجرم میں ... کوئی تو شہر تذبذب کے ساتھیوں سے کہے... یا، مدح قاتل میں مقام
بھی ترے شہر سے آئیں... یا، خیمه عافیت کی طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقت شہر... یہ کیا شہر ہے؟ اس
کی خلقت کیسی خلقت ہے، یہ کس عذاب میں گرفتار ہے اور کیوں گرفتار ہے؟ اوپر منیر نیازی کی شاعری
سے بحث کرتے ہوئے ذکر آیا تھا کہ یہ اردو کی تخلیقی اور ثقا فتی روایت کے اجتماعی لاشعور میں بسا ہوا کوئی
قدیمی نشان ہے، کوفہ، دمشق، یا تیزی سے گزرتے ہوئے آج کا کوئی شہر یا بستی یا ایسا معاشرہ، جو
منافقوں میں گھر گیا ہے یا عذابوں میں گرفتار ہے۔ ان اشعار کو دیکھیے:

عذاب وحشت جاں کا صلہ نہ مانگے کوئی
نئے سفر کے لیے راستہ نہ مانگے کوئی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی
تمام شہر مکرم بس ایک محرم میں
سو میرے بعد مرا خوں بہا نہ مانگے کوئی
کوئی تو شہر تذبذب کے ساکنوں سے کہے
نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی

.....
جس شب ہو تو اجائے بھی ترے شہر سے آئیں
خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں
تیرے ہی شہر میں سرتن سے جدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں
بات توجہب ہے کہ اے گریہ کن حرمتِ حرف
مدح قاتل میں مقاولے بھی ترے شہر سے آئیں

.....
یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزائی بہت ہے
شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر الجھوں میں ویرانی بہت ہے
ہے بازاروں میں پانی سر سے اونچا
مرے گھر میں بھی طغیانی بہت ہے

کسی کے جو روسم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

.....

کس قیامت خیز چپ کا زہر سنائے میں ہے
میں جو چینا ہوں، تو سارا شہر سنائے میں ہے
ایک اک کر کے ستارے ڈوبتے جاتے ہیں کیوں
جائی راتوں کا پچھلا پھر سنائے میں ہے
دیدنی ہے وشتِ اولادِ آدم ان دنوں
آسمانوں پر خدا کا قبر سنائے میں ہے

.....

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبارِ جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے
آج کی راتِ ننھی سی تو بھی اگر بچ رہے تو غیمت
اے چراغِ سرِ کوچہ باد! اب کے ہوا مختلف ہے
اب کے بالکل نئے رنگ سے لکھ رہے ہیں سخن و رقصیدے
حرف تو سب کے سب ہیں رجز کے مگر مذہ عالم مختلف ہے
اب کے میں نے کتاب مساوات اک اک ورق پڑھ کے دیکھی
متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے
خیمه عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

خیمہ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر (کردارِ کوفہ و دمشق) سے جُدا ہوا ایک اور ساختیہ ہے، رزق کی محتاجی اور جاہ پرستی کا جو انسان کے ضمیر کو مار دیتی ہے، اور اسے مصلحت کو شر، ریا کا کار اور غرض کا بندہ بنادیتی ہے، حرص و آز، ہوس اور لامبج کے دروازے کھل جاتے ہیں، جب شہروں، بستیوں اور آبادیوں کا کردار جاتا رہے، تو عام انسان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ رزق کی مصلحت اور انسان کی بے ضمیری اور تن آسانی پر طنز و تعریض ایسا شعری ساختیہ ہے جو افتخار عارف کے یہاں بار بار ابھرتا ہے، اس میں بھی وہ اکثر و بیشتر خود اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہیں، یعنی آج کا انسان ذلت کے اس درجے پر پہنچ گیا ہے کہ اس میں غیرت و عزت نفس تک کا شانتہ نہیں رہا، سرکشی کا حوصلہ تو دُور کی بات ہے۔ اس ساختیہ میں افتخار کی شاعری نے کچھ ایسی کیفیتیں پیدا کی ہیں جو خاص انھیں کے شعری نشانات میں سے ہیں۔ ان میں ذات کے حوالے سے عبید حاضر کے انسان کی جاہ پرستی، مصلحت اندیشی اور تن آسانی پر شدید چوٹ کی ہے۔ یہ تعریض کچھ اپنا ہی لطف رکھتی ہے:

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جبانِ رزق میں توقیرِ اہل حاجت کیا
شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا
دمشقِ مصلحت و کوفہ نفاق کے نیچ
فغانِ قافلہ بے نوا کی قیمت کیا
مالِ عزتِ ساداتِ عشق دیکھ کے ہم
بدل گئے تو بدلنے پہ اتنی حیرت کیا

.....

اب بھی تو ہیں اطاعت نہیں ہو گی ہم سے
دل نہیں ہو گا تو بیعت نہیں ہو گی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ نئی تشیب کے ساتھ
رزق برق ہے یہ خدمت نہیں ہو گی ہم سے
.....

حامی بھی نہ تھے منکر غالب بھی نہیں تھے
ہم اہل تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے
اس بار بھی دُنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
چج آئے سر فریب زر جوہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفۃ سرود نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے
.....

ابھی اُنھا بھی نہیں تھا کسی کا دست کرم
کہ سارا شہر لیے کاسہ طلب نکلا
.....

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے
.....

ہم تو سدا کے بندہ زر تھے ہمارا کیا
نام آورانِ عبدِ بغاوت کو کیا ہوا

.....
قس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

یہ مضمون خاص افتخار عارف کا ہے۔ انہوں نے اپنی کئی نظموں میں بھی یہی سوال انٹھایا ہے اور جاہ پرستی، رزق کی مصلحت اور زرطی پر چوت کرتے ہوئے آج کے انسان کو خبردار کیا ہے کہ وہ تن آسانی کا شکار ہو گیا ہے اور بزرگوں کا لہو اسے آوازنیں دیتا۔ ”آخری آدمی کا رجز“ میں فغانِ خلقِ اہل طائفہ کی نذر ہو چکی ہے اور چاروں طرف سکون ہی سکون ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی دو مختصر نظمیں بھی قابل توجہ ہیں:

ایک سوال

میرے آبا و اجداد نے خرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمہ حق کہا

مقتلوں، قیدخانوں، صلیبوں میں بہتانہوں کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمتِ آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا برہنہ سر کوچہ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی

سو چتارہ گیا

جسم میں میرے ان کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں؟

انی گُنٹ من الظالِمین

پڑھاتو یہ تھا زمین غنبر پہ کشت خاشاک کرنے والے نہیں رہیں گے
سُنا تو یہ تھا ہوا کے ہاتھوں پہ بیعت خاک کرنے والے نہیں رہیں گے
مگر ہو ایوں کہ نیزہ شام پر سر آفتاب آیا
امانت نور جس کے ہاتھوں میں تھی اُسی پر عذاب آیا
اور اب مرے کم حلیف و کم حوصلہ قبیلے کے لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں
ہماری قبریں کہاں بنیں گی؟

خیامِ تسلیم و سائبانِ رضا کی ویرانیاں بتائیں
جو اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کا ٹوں دیکھیں اب ایسی ماں میں کہاں سے لاائیں

یہ سارے ساختے مل کے ایک قوتِ شفا کو راہ دیتے ہیں، جس کے بغیر شعر، شعر تو رہتا ہے اس میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی، اور وہ کیفیت نہیں آتی جو زمانوں اور زمینوں کے فرق کو معدوم کر سکتی ہے۔ افتخار عارف کے لاشور میں ظلم و تعددی، بے زمینی و بے گھری، بے حرمتی و تباہی اور بربادی، نیز منافقت، مصلحت اندیشی اور الہم و اندوہ کی سچائی و اصیلیت کا سارا منظر نامہ اپنی گوناگوں استعاراتی و علامتی کیفیات کے ساتھ اس حد تک پیوست ہے کہ ان کا پورا احساس و اظہار اس میں ڈوبتا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”مبردونیم“ کے شائع ہوتے ہی جدید شاعروں میں افتخار عارف نے اپنی شناخت یک لخت سب سے الگ کر لی، اور ان کی انفرادیت فوری طور پر تسلیم کی جانے

لگی۔ یہ درد جب پوری شعری شخصیت اور شعری وجود کا حصہ بن کر باطن کی آگ میں تپ کر ظاہر ہوتا ہے تو ایک عجیب یقین میں ڈھلتا ہے اور ایک دعا یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے بشارت کا نور برستا ہوا معلوم ہوتا ہے:

سر شاخ صبح کھلا گلب یقین کا
یہ مرا یقین کرم ہے ایک امین کا
یہ نمود و نام مرے وجود کی بازگشت
یہ مرا وجود غبار میری زمین کا
مری ثوت پھوٹ مری نظر کی شکست و ریخت
یہ شکست و ریخت حجاب فتح مُبین کا
میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمت غنیم اور
مجھے اعتبار یہاں کا نہ یہیں کا
کبھی میرے نام سے بھی کوئی سند وفا
کبھی میرے حق میں بھی فیصلہ ہو زمین کا
چلو آؤ شہر گماں میں چل کے صدائے گائیں
کہ وہیں کہیں سے ملے گا اجر یقین کا
کبھی گھل کے لکھ جو گزر رہا ہے زمین پر
کبھی قرض بھی تو اُتار اپنی زمین کا

پروفیسر فتح محمد ملک

افتخار عارف کا کارنامہ خاص

افتخار عارف انحراف کے زمانے میں اثبات کا شاعر ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں کی ادبی اور فکری روایت سے بے رُخی سکھ راجح وقت تھا میں اس زمانے میں افتخار عارف نے ہماری اپنی ادبی اور فکری روایت کی تردید کے چلن سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی انسان دوست، روشن خیال اور ترقی پسند ادبی و فکری روایت کے تخلیقی اثبات کا رویہ اپنایا۔ میں افتخار عارف کے اس فنی نقطہ نظر کو تاریخی اور تخلیقی ہر دو اعتبار سے ایک کارنامہ خاص قرار دیتا ہوں۔

(2)

تاریخ انسانی میں سب سے پہلے اسلام نے خاندانی بادشاہت کے تصور کو رد کیا۔ اسلام نے لا قیصر ولا کسری کے امتیازات کو مٹا کر ان اکرامکم عنده اللہ اتقا کم کے خالص انسانی معیار کو شرف و عظمت کی معنبر بنیاد قرار دیا۔ یوں خاندانی شہنشاہیت کا بت پاش پاش ہوا اور اس کی جگہ عظمت کردار اور خدمت آدمی پر منی خلافتِ اسلامی کا تصور جا گزیں ہوا، مگر مرد رایا م کے ساتھ خلافت آہستہ آہستہ پھر سے ملوکیت سے قریب ہونے لگی اور بالآخر یزید نے خلافت کو خاندانی بادشاہت میں تبدیل کر کے اسلام کے سیاسی نظام کو رد کر دیا۔ حضرت حسینؑ نے اپنی بے سروسامانی اور اپنے عہد کی باطل پرستی کے باوجود شہنشاہیت کے اس غیر اسلامی تصور کو چیلنج کیا۔ آپ نے انتہائی نامساعد حالات میں باطل کے ساتھ صلح

کرنے کی بجائے حق کی سر بلندی کی خاطر جان دے کر اسلام کو مٹنے سے بچایا۔ حضرت امام حسینؑ ان کے اہل خاندان اور فرقہ ان جاثر کی یہ قربانی مسلمانوں کے ادب میں صدیوں سے جاری سرچشمہ فیضان کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ باطل کی اندھی قوت کے مقابل حق کے ڈٹ جانے کی یہ ادا ہمارے صوفیوں، شاعروں اور ادیبوں کو نت نئی تخلیقی زرخیزی دیتی چلی آئی ہے۔ مسلمانوں کے ادب میں نہ تو واقعہ کر بلکہ صرف اور محض ایک تاریخی واقعہ ہے اور نہ شہدائے کر بلا صرف محض تاریخی کردار ہیں۔ یہ لوگ تو زمان و مرکان سے ماوراء زندہ و منور استعارے ہیں جو ظلم و استبداد کے اندر ہیروں میں ہمیشہ مینارۂ نور کی مانند درختاں رہتے ہیں۔ یہی ہے وہ منہوم جس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جناب امام حسینؑ کو بنائے لا الہ قرار دیا تھا اور اقبال نے کہا تھا :

تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ ہون اور چمنِ ایجاد کرد

اگر ہم خود کو صرف اردو ڈنیا تک محدود رکھیں تو ہمیں اردو زبان میں ادبی اظہار کے آغاز سے لے کر عبیدِ حاضر تک شہدائے کر بالا کا فیضان نمایاں نظر آئے گا۔ شعرو شاعری کے میدان میں ولی سے لے کر اقبال اور ندیم تک اور نشر کے میدان میں فضلی کی کربل کتحا سے لے کر قرۃ العین حیدر اور انتظام حسین کے افسانوں تک ہمیں جرأت و شجاعت اور ایثار و جاں فروشی کے اس عظیم رزمیہ کی عیاں یا نہماں جھلک ضرور نظر آئے گی۔ ہر زمانہ میں اثر و تاثیر اور فیض و اکتساب کے اسلوب بدلتے رہے ہیں مگر مقامِ شبیری ایک ابدی حقیقت بن کر اردو ادب کے قالب اور روح دونوں کو برابر زندگی اور تو انانی بخششان رہا ہے۔

اردو ادب کی ابتدائی نشوونما چونکہ زوال کے زمانے میں ہوئی تھی اس لیے قدیم ادب میں سانحہ کر بالا کا بیان زوال و ابتری کے زمانے کے معاشرتی اور اخلاقی تقاضوں کے حوالے سے ملتا ہے۔ اس اندازِ فکر و اظہار کا نکتہ عروج انہیں اور دیبر کے مژشوں میں نظر آتا ہے۔ انہیں ودیبر گویا مرشیہ گوئی سے

اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زوال کے سامنے بند باندھنے اور اپنے ہم نفوں کو زوال و ادبار کے گھٹاؤ پر اندھیروں میں بھی شہدائے کر بلکہ جرأتِ فکر و عمل سے روشنی لینے کا درس دیتے ہیں، چنانچہ عہدِ قدیم کے ادب میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور ڈرامائیت کے فنی ساز و سامان کے ساتھ سانحہ کر بلکہ ہمارے خاص قومی پس منظر میں از سر نوزندہ کیا گیا۔ لیکن حالی کی مسدس سے شروع ہونے اور اقبال کے ہاں تکمیل کو پہنچنے والے جدید ادب میں اس سانحہ کو ادب کے خمیر و ضمیر میں حل کر لیا گیا۔ انہیں کے ہاں سانحہ کر بلکہ غم اگر ہمارے ادب کی آہوں سے آنسوؤں کا سیلا ب بن کر رواں ہے تو اقبال کے ہاں یہی غم ہمارے ادب کے رگ و پے میں اترتتا اور ایک نیا چمن ایجاد کرتا نظر آتا ہے۔ اقبال کے ہاں امام حسینؑ ماضی کی ایک عظیم ہستی بھی ہیں، حال کا سرمایہ افتخار بھی ہیں اور مستقبل کی ایک پُرسوز اور تابناک آواز بھی:

چشمِ حجاز منتظر، ریگِ عراق تشنہ کام
خونِ حسینؑ بازدہ، کوفہ و شامِ خویش را
قافلہ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس اعتبار سے دیکھیں تو سانحہ کر بلکہ اقبال کی شاعری میں زمان و مکان کی حدود توڑ کر ایک بسیط کائناتی پس منظر بن گیا ہے۔ انسانی ارتقاء اور خیر و شر کی ازلی وادی کشمکش اسی سانحہ کی نسبت سے بیان ہوتی ہے:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری^۱
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

اقبال کے ہاں مویٰ و فرعون، مصطفیٰ و بولہب اور شبیر و یزید فقط تاریخی کردار ہی نہیں بلکہ خیر و شر کی ازلی کشمکش کے استعارے ہیں۔ اقبال نے ان جیسے درجنوں تاریخی کرداروں کو مسلمانوں کے ماضی کی پرستش

کے جذبے سے نہیں بلکہ انسانوں کے ابد تک پھیلے ہوئے مستقبل کو روشن کرنے کی خاطر آفاقی استعاروں میں بدل دیا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد میں برپا حق و باطل کے تصادم کے گوناگون نقوش کو اسلامی تاریخ کے ان کرداروں کی وساطت سے یوں ابھارا ہے کہ انسانی ارتقا کی پوری سرگزشت ان کرداروں کے فکر و عمل میں منعکس ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ عکاسی ایسے فنی اعجاز کے ساتھ کی گئی ہے کہ عصرِ رواں کا سوز و ساز، دورِ رفتہ کے درود و داع اور زمان آئندہ کی جستجو و آرزو سے ہم آغوش ہو کر لازمانی اور لامکانی حسن کو آواز دینے لگا ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کا انفرادی اور اجتماعی مقدار ہو یا نفس و آفاق میں برپا خیر و شر کا تصادم ہو یا انسان کی غیر مختتم آرزو میں اور ہمیشہ تشنہ تکمیل رہنے والی جستجو میں ہوں، اقبال ان کی تخلیقی تفہیم و تعبیر اور ان کی فنی و جمالیاتی صورت گردی کے عمل کو اضمام خیالی (مالی تھالوجی - دیو مala) کی تیرہ و تارفضا میں نہیں سرانجام دیتے بلکہ اسلامی تاریخ کی حقیقی دنیا کی دھوپ کی طرح روشن اور چاندنی کی طرح اجلی فضا میں لے آتے ہیں۔ ان کے استعارے تو ہماقی قصے کہانیوں کے فرضی کرداروں کی بجائے حقیقی انسانی تاریخ کے اسلامی دور کے جیتے جائیں، دیکھے بھالے اور وقت کی کڑی آزمائش پر پورے اُترتے ہوئے کرداروں سے مانوذ ہیں۔ دیو مala کی بجائے تاریخ پر اس انحصار نے جہاں شاعرانہ صداقت کو سائنسی صداقت کی سوت نہیں بلکہ زوجین بنادیا ہے وہاں ان کی آفاقیت کو ایک نمایاں اسلامی شناخت بھی بخشی ہے۔ یہ جدا گانہ اسلامی شناخت اور پر سے مسلط کی گئی شناخت نہیں بلکہ سرز میں کے قلب سے قدرتی طور پر یوں پھوٹی ہوئی شناخت ہے جیسے شاخ گلاب سے گلاب کا پھول پھوٹا، کھلتا اور دل صد چاک کی مانند اپنے باطنی حسن کو خارجی قالب عطا کر دیتا ہے۔

آفاقی ادب کی اس اسلامی شناخت کے خلاف اقبال کی زندگی ہی میں رہ عمل شروع ہو گیا تھا۔ رواں صدی کی تیسری دہائی میں مارکس کے معاشی ہمسہ اوسٹ اور فرائیڈ کے جنسی ہمسہ اوسٹ کے سیکولر تصورات کے زیراثر پروان چڑھنے والی نسلوں کے ادیبوں نے اقبال کے روحانی ہمسہ از اوسٹ سے پھوٹنے والے

تصور کائنات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے نام پر آفاقی ادب کی اسلامی شناخت کی نفی میں ایک ایسی ادبی روایت کی تخلیق و ترویج عمل میں آئی جو تاریخی صداقت کی بجائے دیومالا کے افسانہ و افسوس کو زیادہ معتبر قرار دیتی ہے۔ جدید اور جدید تر مغربی ادب تو اس بنابر یونانی علم الاصنام اور ہندوستانی دیومالا کے کرداروں اور کہانیوں کے پس منظر میں عصری زندگی کے عذاب ثواب کی عکاسی پر نازار ہے کہ اس کے تہذیبی خزانے میں اسلامی تاریخ کا عمل دخل کبھی نہیں رہا۔ اس کے برعکس تقلید کی روشن اپنا کر ہمارا تخلیقی فنکار جدیدیت کا علم ہرانے لگا۔ اقبال تہذیبی خودکشی کے اس عمل کو ایک گونہ اضطراب سے دیکھتے اور نوجوان فنکار کو خبردار کرتے رہے کہ جن فلکری اور تخلیقی فیشنوں پر وہ اپنی عقل بارنے میں مصروف ہیں وہ تو افرنگ میں بھی فرسودہ ہو چکے ہیں... تازہ اش جز کہنا افرنگ نیست... اور:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازہ تجدید
مشرق میں بے تقلید فرنگی کا بہانہ

اقبال ان لوگوں کو مقلد بننے کی بجائے صاحبِ ایجاد ہونے کی تلقین کرتے رہے مگر یہ لوگ اقبال کی مسلمانوں کے مقدر کے ساتھ جملی وابستگی کو قدامت پسندی سمجھ کر مارکس اور فرائیڈ کے دبتانوں میں مقبول ہونے والے سیکولر تصورات کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے رہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت ہر دو تخلیقی کارروانوں میں عہد کے ذہین ترین اور خلائق ترین نوجوان شامل تھے۔ اس لیے ان کی تخلیقات نے اردو ادب میں مغربی ادب و فلکری روایت کی تقلید میں ایک نئی روایت بنائی، اسے رواج دیا اور لگ بھگ نصف صدی تک اس روایت کا بول بالا رکھا۔ اس نئی روایت نے اردو ادب میں تین لاوارث نسلیں پیدا کیں۔ لاوارث اس لیے کہ ان لوگوں نے شعوری طور پر خود کو مسلمانوں کی ادبی و فلکری تاریخ اور مسلمانوں کے ادبی و فنی سانچوں سے دستبردار اور مارکسی ادبی منصوبہ بندی اور فرائیڈی تاریک اندیشی کا علمبردار ٹھہرایا۔ افتخار عارف نے اس مقلدانہ روایت کو دوسرے سلام کیا اور اپنے اور اپنی ملت کے مسن میں ڈوب

کرزندگی کا سراغ پانے کا کٹھن تخلیقی مرحلہ سر کرنے کی ٹھانی۔ کیوں نہ ہو:

مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

وہ لکھنؤ ہو یا کراچی، لندن ہو یا اسلام آباد..... افتخار عارف خارج کے آب و باد و خاک کے کرم اور ستم کی پذیرائی اپنے باطن کی آب و ہوا میں سانس لیتے ہوئے کرتا ہے اور اقبال کی آواز کو اپنے دل کی آواز جانتا ہے:

باز و ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دلیں ہے تو مصطفوی ہے

یوں افتخار عارف نے اقبال کی انقلابی شاعری سے اردو شاعری کا ٹوٹا ہوارشتہ پھر سے جوڑ کر ایک نئے انداز کی ترقی پسند شعری روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ عصر حاضر میں معاشی اور معاشرتی عدم مساوات اور سیاسی جبر و استبداد کی ترویج میں ہمہ تن منہمک قاہرو جابر قوتون کو لکھا رہتے وقت اسلام تاریخ سے جس طرح روشنی اور قوت اخذ کرتے ہیں اس کی بہترین مثال ابوذر غفاری اور اسماء بن زید پران کی نظمیں ہیں۔ اپنے انقلابی مسلک سے پھوٹی ہوئی ان نظموں میں افتخار عارف نے بے شک ان تاریخی شخصیات سے اپنی اٹوٹ محبت کی بنا پر اعتمنا کیا ہے مگر خدا لگتی کہتا ہوں کہ انسانی تاریخ کے علاوہ دُنیا یے انسانیت کے اضامِ خیالی میں بھی ان انقلابی تصورات کی مکمل تجسم کہیں اور نہیں ملتی۔ ”ابوذر غفاری“ کے لیے ایک نظم، کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ یہ نظم ابوذر غفاری کے لیے نہیں بلکہ میرے آپ کے لیے اور میری آپ کی آئندہ نسلوں کے لیے ہے:

مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا

وہی مدینہ ہے اور ابوذر ہیں اور منبر ہے اور منبر کا فیصلہ ہے
اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے وہ قول صادق سے مختلف ہے

جو قولِ صادق سے مختلف ہے وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان
اک سوال بن کر پھر گیا ہے
بہت زمانہ گزر گیا ہے، مگر ابوذر رنگاہ میں ہیں ہیں
پس کمیں گاہِ جہر زور آوروں کی سازش کے سارے منظر
رنگاہ میں ہیں
 دمشق و بغداد و قرطبه کے سلاسلِ مصلحت کی بخشش
پہ پلنے والے تمام منظر رنگاہ میں ہیں
جہاں مظلوم خواب دیگر کا منتظر ہے
نیاز مانہ نئے ابوذر کا منتظر ہے

اسلامی انسان دوستی کے مثالی تصورات کو نا مساعد ترین حالات میں اپنی اور اپنے عصر کی عملی زندگی میں
جلوہ گرد یکھنے کی تمنا میں حضرت ابوذرؓ نے جس استقامت، ایثار اور عشقِ رسولؐ کی مثال پیش کی ہے
افتخار عارف اسے عصرِ رواں اور زمانِ آئندہ کے جبرا و استبداد سے نجات دلانے کے جہاد میں سرچشمہِ فیضان
سمجھتے ہیں۔ اسی طرح رنگِ نسل کے جاہلی تعصبات سے عہدِ حاضر کو آزاد دیکھنے کی تمنا افتخار عارف کو اس
دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل کے انقلابی کردار کی ایک بار پھر تحسین کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس نے
غبار را کوفرو غ وادی سینا بخشتا تھا یعنی جس نے گری پڑی اور ٹھکرائی ہوئی مخلوق سے محبت کو اللہ کی عبادت کا بلند
ترین درجہ قرار دیا تھا اور جس نے حضرت اسامہ بن زید کو جو ایک آزاد غلام تھے، لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ عرب
قبائل کے ممتاز ترین نمائندوں کو ان کی اطاعت پر مجبور کیا اور یوں انہیں نام نہاد سردارانہ نخوت سے رہا کر کے
انسانی مساوات کی عملی تربیت دی تھی۔ نظم کا آخری حصہ آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دے گا، تو لیجئے پڑھیے:

اب بھی نخوت ہے وہی جبہ و دستار کے نیچے
وہی معیارِ شرف درہم و دینار کے نیچے

اک غلام ابن غلام ابن غلام ابن غلام
اب بھی نرغے میں ہے کہ اک شہرِ دل آزار کے پیچ

.....

نرغے اہلِ تکبر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیق نہیں ہے کہ بچا لے مجھ کو!

جب افتخار عارف ہمارے زمانے کی نئی جاہلیت کی قاہرو جابر قوتیں کولکاراتے وقت کسی ابوذر، کسی صدیق اور کسی حسین کے نئے ظہور کی تمنا کرتے ہیں تو ان کی شاعری اقبال کی شاعری کو آواز دیتے بلکہ ہے:

وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربت کاری!

(3)

جس زمانے میں افتخار عارف نے اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ زمانہ ہمارے ہاں داروں سن کی پر چھائیں سے فرار، عمل کی رایگانیت پر اصرار اور زندگی کی بے معنویت کے فلسفوں کے پر چار کا زمانہ تھا۔ نوجوان لکھنے والے ۳۶ء کے باغیوں کے خلاف بغاوت کی دھن میں زندگی ہی سے منہ موڑ چیٹھے تھے اور ادب کی سماجی ذمہ داری اور ادب کے انقلابی کردار کے تصورات کو مبتذل گردانے لگے تھے۔ افتخار عارف اس رسم و رہ عالم سے ہٹ کر چلے اور انہوں نے معاشرتی اور تہذیبی وابستگی کو اپنے فن کا بنیادی حوالہ بنایا:

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹھی کو در بدر کر دے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو معتبر کر دے

.....

بانغ بغضے میرے جب جب نذر لہو کی چاہیں
میری برکت والی منشی مجھے بلانا بھولے ناں

ہماری تہذیب میں زمین کی اہمیت فقط اس قدر ہے کہ یہ ہمارے اجتماعی خوابوں کا مستقر ہے۔ زمین ہمارے خواب کا بدن ہے۔ خواب نہیں تو جغرافیائی وجود کی مشت خاک، طوفانِ حادث کے سامنے کہاں نجھرے گی؟ افتخار عارف کو اپنے خواب سے اٹوٹ وابستگی کا عبد اس لیے کرنا پڑا ہے کہ اس کے گرد و پیش لوگ خواب سے کٹ کر جینے میں مگن ہیں اور نہیں سوچتے کہ:

یہ تیرے میرے چرانوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا گلتا ہے

.....
ہوا بھی ہو گئی یاثاق تیرگی میں شریک
کوئی چراغ نہ اب ریگزر میں رکھا جائے

.....
جو ڈوہتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیاس بھی مرا ہے
جو ہاتھ اٹھے تھے وہ سمجھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا تھا وہ گریباں بھی مرا ہے
مشی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی
یوں ہو تو یہ زنجیر، یہ زندگی بھی مرا ہے

افتخار عارف کے ہاں خواب اور خاک کا رشتہ کچھ یوں ہے کہ زمین بے شک اس کے لیے آخری حوالہ ہے، مگر اس سے بھی عظیم تر صداقت یہ ہے کہ مشی کی گواہی سے بڑی دل کی گواہی ہے۔ اس لیے زنجیر اور

زندان کا سامنا لازم ٹھہرا۔ فیض اور ندیم کے بعد کی نسلوں کے ترقی پسند شاعروں میں دار و رسن اور زندان و مقتل کی لکیر پینے والوں کی کمی نہیں مگر افتخار عارف دو جہے سے ان شاعروں سے نمایاں طور پر مختلف شخص اور شاعر ہے۔ اول یہ کہ اس کے ہاں جاں سپاری اور سرفروشی کے بلند بانگ مگر کھو کھلے اذعا کی بجائے سلامتی جسم و جاں کے لیے مفاہمت پسندی پر ندامت کا وہ جان سوز احساس کا فرماء ہے جو خود اخسابی کی کٹھن راہ اپنانے کا ثمر ہے۔

چج آئے سرِ قریبَ زر ، جو ببر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

.....
کہاں کا خیر ، کیسی حرمت لفظ و معانی
میں دُنیا میں ہوں اور اسباب دُنیا چاہتا ہوں

.....
شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ، ہم کیا ہماری ہجرت کیا
 دمشق مصلحت و کوفہ نفاق کے چج
فغان قافلہ بے نوا کی قیمت کیا

.....
قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

.....
ہوں لقمه تر کھا گئی لبھ کا جلال
اب کسی حرف کو ہُرمت نہیں ملنے والی

اور دوم یہ کہ سرگزشت ملکت بینا اس کے فکر و شعور کا سرچشمہ اور جذبہ و احساس کی جنم بھوی ہے۔
شہدائے کربلا کے ساتھ اپنی نبتوں کا جیتا جا گتا احساس اس کے لیے فخر و ناز کا سرمایہ بھی ہے اور
درد و کرب کا الا و بھی۔ شہدائے کربلا کے ساتھ اپنے ہم رشتہ ہونے کا شعور اسے اپنی اجتماعی ذمہ داری کی
یاد برابر دلاتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مقدرا اور اپنی ہستی کے مصائب پر داستانِ حرم ہی کے سیاق و سبق
میں غور و فکر کرتا ہے:

ملے تو کیسے ملے منزلِ خزینہِ خواب
کہاں دمشق مقدار کہاں مدینہِ خواب

.....

میں وہ ہوں کہ میرے چہار سمتِ خنیم اور
مجھے اعتبار یسار کا نہ یہیں کا

.....

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوجہ سنال پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

.....

سپاہِ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے ، پروردگارِ شب نکلا

.....

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صحح سوریے رن پڑنا ہے اور گھسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اٹا شہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

.....

دل ان کے ساتھ مگر تغ اور شخص کے ساتھ
یہ سلسلہ بھی کچھ ابل ریا کا لگتا ہے

وہ بستی جو افتخار عارف کی شاعری میں کہیں کہیں سانس لے رہی ہے اور جسے خود اس نے کہیں ناہین ابستی کہا
ہے، کہیں قبر مان بستی کا نام دیا ہے اور کہیں شہر تذبذب سے موسوم کیا ہے ظلم و ستم کی پیٹ میں ہے۔ اس بستی
کے درود یوار پر خوف و دہشت مسلط ہیں۔ اس کے میں خیامِ تسایم و سائبان رضا میں ہی ہی آواز سے
ڈر رہے ہیں۔ اپنے ہی چہروں سے ثرماء ہے ہیں اور اپنے ہی سائے سے گھبرا رہے ہیں۔ یہاں:

”نہ اختبار حرف ہے نہ آہروئے خون ہے“

اور

فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جون ہے
سکون ہی سکون ہے

(آخری آدمی کا رجز)

اس بستی کے لوگ جنہیں افتخار عارف نے اپنی ایک نظم میں ابل انتظار قرار دیا ہے ناخداوں کے
جور و جفا سے نجات کے لیے اپنے خدا کو یوں پکارتے ہیں:

شکاری اپنے باطن کی طرح اندر ھے شکاری

حرمتوں کے موسموں سے نا بلد ہیں

اور نشانے مبتند ہیں

جگہ گاتی جا گئی شاخوں کو بے آواز رکھنا چاہتے ہیں
ستم گاری کے سب در باز رکھنا چاہتے ہیں
خداوند! تجھے سمجھے ہوئے باغوں کی سوگند
صداؤں کے ثمر کی منتظر شاخوں کی سوگند
اڑانوں کے لیے پرتو لئے والوں پر اک سایہ تحفظ کی ضمانت دینے والا
کوئی موسم بشارت دینے والا

(خوف کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم)

اور اپنے مصائب پر اپنی تاریخ و تہذیب کی روشنی میں یوں تڑپ کر سوچتے ہیں:

تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

ہمارے سب خواب وقت کی بے لحاظ آندھی میں جل بھیں گے
دونیم دریا و چاہ تاریک و آتشِ سرد و جانوازی کے سلسلے ختم ہو گئے کیا؟
تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

خدا یے زندہ! یہ تیری سجدہ گزار بستی کے سب مکینوں کی التجا ہے
کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ تجھ سے منسوب گل زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ عفو کی، در گزر کی، مہروفا کی بھولی روایتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ چاہیتیں، وہ رفاقتیں، وہ محبتیں پھر سے لوٹ آئیں

(استغاثہ)

نہیں بھائی نہیں! ملوکیت کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی التجا میں اللہ کریم نے کب سنی ہیں اور
حکمتِ فرعونی کے سہارے قائم سیاسی اور اقتصادی نظام میں اسلامی اخلاق کیونکر پنپ سکتا ہے؟ جس

معاشرے کی سیاسی اقدار دو رجاہیت سے مستعار ہوں اس میں اسلامی حریت و مساوات کا خواب دیکھنے والوں کا مقدراں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے:

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر اور اک اکیلا میں
میرے ہاتھ عصما سے خالی

(ابوالہول کے بیٹے)

یہ زمینوں آسمانوں کے عذاب اور میں اکیلا آدمی
میں اکیلا آدمی کب تک لڑوں
سارے دشمن در پے آزار، لشکر صفحہ صفحہ
لشکروں کے سب کمانداروں کے رخ میری طرف
اور میں نہتا آدمی
اور میں نہتا آدمی کب تک لڑوں
میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں

(بل من ناصر اینصر نا)

شہر تذبذب میں فرعونوں کے لشکروں کے مقابلے میں اپنے یک و تنہا ہونے کا احساس افتخار عارف کو
اماں گاہِ مصلحت میں لا بٹھاتا ہے مگر یہ سوال اسے یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا اور ضمیر میں کائنے کی طرح
کھلکھلتا رہتا ہے کہ:

مرے آبا و اجداد نے حرمتِ آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کامہ حق کہا

مقتلوں، قید خانوں، صلیبیوں میں بہتا ہوان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ ہو حرمت آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا بر جنہ، سر کوچہ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے ان کا ہو بے تو پھر یہ ہو بولتا کیوں نہیں؟

(ایک سوال)

اسلامی خواب و خیال اور روایات و اقدار سے اسلام کے نام پر منحرف ہو جانے والی دنیا میں ان آئیڈیلیز
کی پاسداری کتنی کٹھن ہے، اس کا اندازہ شاعر کے اس تجربے سے کیجئے جو درج ذیل نظم کا صورت گر ہے:
یہ دنیا اک سور کے گوشت کی ہڈی کی صورت
کوڑھیوں کے ہاتھ میں ہے
اور میں نان و نمک کی جستجو میں در بدر قریبہ قریبہ مارا مارا پھر رہا ہوں
ذرا سی دیر کی جھوٹی فضیلت کے لیے
ٹھوکر پہنچ کر کھا رہا ہوں ہر قدم پر منزل عز و شرف
سے گر رہا ہوں
اور مری انگلشتری پر یا علیٰ لکھا ہوا ہے
مگر انگلشتری پر یا علیٰ کندہ کرالینے سے کیا ہو گا
کہ دل تو مرجبوں کی دسترس میں ہے

(عجب عالم ہے آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل سینوں میں اندھے ہو چکے ہیں)
 اور ایسے میں کوئی حرفِ دعا ک خواب بنتا ہے
 کبھی سلمان آتے ہیں
 کبھی بوذر، کبھی میشم، کبھی قنبر، میری ڈھارس بندھاتے ہیں
 کمیل آتے ہیں کہتے ہیں
 ”پکار و افتخار عارف پکارو
 اپنے مولا کو پکارو، اپنے مولا کے ویلے سے پکارو
 ”اجیب الدعوۃ الداعی“ کا دعویٰ کرنے والے کو پکارو
 یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے دل چھوٹا نہیں کرتے
 کریم اپنے غلاموں کو بھی تباہ نہیں کرتے۔

(یا سریع الرضا اغفر لمن لا یملک الا لدعا)

اس نظم کا شاعر اپنی فلکری اور روحانی تہائی کو قرینِ اول کی بہادر شخصیات کی فلکری اور روحانی یگانگت سے
 انجمان آرائی کی شکل دیتا ہے یوں جیسے اقبال نے کہا تھا:

از زمان خود پشیمان می شوم
 در قرونِ مصطفیٰ پیاس شوم

یہ قلب کی آنکھ سے دیکھنے والی ان شخصیات کا فیضان ہے کہ افتخار عارف..... بالآخر یہ خون جوش مارتا
 ہے اور وہ خیمهٗ عافیت کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں جانتا تھا میرا قبیلہ سر بریدہ اور بے رد اسرؤں کی گواہیاں
 لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے

سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا
سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا
اور اب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو نذرِ سر لے کے آگیا ہوں
تباه ہونے کو ایک گھر لے کے آگیا ہوں
میں لا کھ بُزدل سبھی مگر میں اسی قبیلے کا آدمی ہوں

(اعلان نامہ)

تذبذب سے یقین تک اور مفاہمت سے مرا جھت تک یہ ذہنی اور جذباتی ارتقا افتخار عارف کو اقبال کی انقلابی شعری روایت اور میرے دل سے قریب لے آتا ہے۔ اقبال تک پہنچتی ہوئی اور اقبال کے ہاں نیا رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہوئی مسلمانوں کی ادبی روایت کب سے اپنے وارثوں کی منتظر ہے؟

شہرِ جمیع کے دروازے پر

شہرِ جامع کے دروازے پر



افتخار عارف نے جدید مضامین و مطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کہب فیض کیا ہے کہ تائیج کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز و نایا سامان پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق و طلب، ایثار و جاں فروشی، جبر و تعدی کا بیان صرف منصور قیس اور فراہاد و جم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب گھر میں دار و درسن کی بات چلی تو تائیج و صلیب کے حوالے بھی آگئے، لیکن الیہ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر پیشتر سلام اور مرثیہ تک محدود رہا۔ صرف علامہ اقبال کی نگہ وہاں تک پہنچی۔ افتخار عارف نے گزارش احوال واقعی کے لیے اس مأخذ سے بہت اثر آفرین اور خیال افروز کام لیا ہے۔

فیض احمد فیض

افتخار عارف کی شاعری میں دو صفاتیں ہیں جن میں ان کا کوئی ہمیصر حصہ نہ تھا نظر نہیں آتا۔ سوانح کے مل پر وہ اپنے ہمیصروں کے بیچ متاز نظر آتے ہیں۔ ان میں اول ان کی مذہبی شاعری ہے، مگر افتخار عارف نعمت گوئیں ہیں، نہ مرثیہ نگار ہیں، وہ تو بہت سے ہیں۔ ہمارے یہاں نعتیہ شاعری، مرثیہ اور منقبت کی ایک بھرپوری پری روایت ہے جو مجاہس عزما اور میلاد کے واسطے سے پرواں چڑھی ہے۔ ایک تیری محفل اور ہے جس کو ہمارے زمانے کے میدیا نے فروع بخشائے یعنی ریڈی یا اورٹی وہی پر منعقد ہونے والے نعتیہ مشاعرے اور مصالے۔ اس روایت کے مل پر نعمت، منقبت اور مرثیہ نے اپنا ایک الجھ وضع کر لیا ہے۔ اب ان اصناف کے اپنے رسمی لمحے ہیں۔ افتخار عارف کی جیت یہ ہے کہ ان کے یہاں نعمت، میلاد یا نعتیہ مشاعرے کے واسطے نہیں آئی ہے اور واقعہ کر بلکہ مجلس اور سکی مرثیہ کے واسطے سے موضوع شعر نہیں بنتا ہے، یہ شاعری ان کے اندر سے ہوئی ہے، اس باطن سے جو عقیدت کے جذبے سے لبریز ہے، سو یہاں عقیدت کا جذبہ درستی اصناف کے واسطے نہیں آیا، تخلیقی تجربہ کی صورت طلوع ہوا ہے۔

ہاں ایک بات اور.... واقعہ کر بلکے حوالے سے جو شاعری افتخار عارف نے کی ہے اس میں ایک علامتی سلط بھی ابھرتی نظر آتی ہے۔ پہلی بار اقبال کے یہاں کر بلانے تخلیقی سلط پر استعاراتی شکل پائی تھی۔ دوسری مرتبہ یہ واقعہ افتخار عارف کی شاعری میں گزر ہے۔ میں نے تخلیقی کا تکڑا ایسے سوچ کر لگایا ہے کہ کر بلکہ بھی تواب ہماری شاعری میں ایک رسمی استعارہ بن چکا ہے۔

دوسرے نمبر پر ان کے یہاں بے گھری کا احساس ہے۔ اک بھرت اور اک مسلل در بدری کا قصد۔ کس کس رنگ سے، کبھی علائی، کبھی کسی پر دے میں چھپ کر کسی علامت، کسی استعارے میں گوندھ کروہ اس شاعری میں اپنا اظہار پاتا ہے اور جب شاعر خدا سے مکان کو گھر بنانے کی دعا کرتا ہے تو یہ فرد کے لیے سے بڑا کرایک تہذیبی الیہ بتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک تہذیب تھی جب آدمی تمبلہ اور چیزوں کے اپنے گھر سے بھی پہچانا جاتا جاتا تھا۔ اب ہم آپ مکانوں میں رہتے ہیں، ٹیکیوں میں، اپارٹمنٹوں میں، کوٹھیوں میں۔ آج یہاں کل وہاں، گھر کہاں ہے جو آدمی کو باندھ کر رکھتا ہے، جیسے اس کی بھی جڑیں ہوں اور کوئی گھری بنیاد۔ تو یہ بے گھری کا جور و نتا ہے وہ ایک پوری تہذیب کا نوجہ ہے۔ بھرت کے تجربے میں تو لکھنے والے شریک ہیں مگر بھرت کے تجربے سے جو یہ ایک جہت نکالی ہے وہ افتخار عارف سے خاص ہے۔

انتظار حسین

افتخار عارف ہماری ادبی دنیا میں ایک نئے طرزِ فکر و احساس کے ساتھ طلوع ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ہاں مغرب کی ادبی اور فکری تحریکوں کے زیر اثر مادی بحد اوسست کا ڈنکہ نیج رہا تھا۔ ماوراء کے جہاں سے آس پاس کی دنیا کا رشتہ کش چکا تھا۔ دل کی آنکھ کے وجود سے انکار اور ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے پر اصرار، جدت پرستی اور ترقی پسندی کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔ ایسے میں جب ہماری ادبی دنیا میں افتخار عارف کی مسلمانوں کی روحانی روایات میں رچی بسی آواز گوئی تو اقبال کی شعری روایت سے عصری شاعری کا کٹا ہوا رشتہ پھر سے بحال ہو گیا اور ماضی کو حال میں سرگرم کار بنا کر مستقبل کی صورت گری کرنے کا چلن پھر سے زندہ ہو گیا۔ افتخار عارف کے ہاں حمد، نعمت اور منقبت رسمی اور "موکی" تفاصیلوں سے نہیں بلکہ جلی روحا نیت کے مد و جزر سے تخلیق پاتی ہیں۔ وہ بے یک وقت دو زمانوں میں سانس لے رہے ہیں۔ ان کا اپنا زمانہ شرکی قوتوں کے حصار میں قید ہے۔ اس کے حصار کو توڑنے کے عمل میں وہ مسلمانوں کے ماضی کی اُن لازماں اور لامکاں ہستیوں کو اپنا ہمیصر بلکہ ہدم و دماساز اور رہبر و رہنمایا ہیتے ہیں۔ چنانچہ محمد علیؒ، علیؒ، حسینؒ، ابوذرؒ، سلمانؒ (یعنی مسلمانوں کی زندہ منور روحانی تاریخ افتخار عارف کے لیے آج کی واردات بن کر رہ جاتی ہے۔ یوں ماضی حال بن جاتا ہے اور شرکی قوتوں کا حصار نوٹ کر رہ جاتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ کلام کے تمام تر مندرجات اس حقیقت کا منہ بولتا شہوت ہیں۔